JUNE
2026

جدید ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
لاہور

بیاض

ابنِ انشاء
JUNE
15

خالد احمد
JUNE
5

سالگرہ مبارک

مجید امجد
JUNE
29

کشور ناہید
JUNE
18

ریاض کی سالگرہ کے موقع پر احباب کے ساتھ

جناب خالد احمد گورنر پنجاب لطیف کھوسہ سے صدارتی ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

محترمہ سیما پیروز، محترمہ بلقیس ریاض، جناب خالد احمد، محترمہ سلمیٰ اعوان

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

دل دھڑکا ، دل دہلا، زہر پیا البتہ
پہلا اور رُوپہلا ، پیار کیا البتہ

دیکھا ، ایک سیہ تل ، اِک قاتل سی جھلمل
ہار گئے جاں ہم، دِل جیت لیا البتہ

جگنو، چاند ، ستارے بجھ گئے آنکھ کنارے
جاگا ساتھ ہمارے ایک دِیا البتہ

اُس کے ہاتھ میں دیکھا، حال اپنی قسمت کا
ہاتھ اُس ہاتھ میں اپنا چھوڑ دیا البتہ

پیار سے بھر پائے ہم ، کچھ بھی نہ کر پائے ہم
جیے نہ مر پائے ہم ، زہر پیا البتہ

گونج ، گرج سے ڈر کے اور بھلا کیا کرتے
بانہوں میں اُن کو ہم نے کھینچ لیا البتہ

رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی ، جان لیا البتہ

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور
ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - جون 2026 - شمارہ نمبر: 6

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب خالد احمد، جناب ابن انشاء
محترمہ کشور ناہید، جناب مجید امجد

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز
سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد بنگلہ گل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	محمد افضال انجم	7
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد افضال انجم سرور حسین نقشبندی	8 تا 12
3	عقیدت	اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، مظہر امام، ریاض ندیم نیازی افروز رضوی، احمد جلیل، فیض رسول فیضان، صغیر احمد صغیر مرزا آصف رسول، عمود ابرار، نعمان منظور	13 تا 24
4	رباعیات	سعید اشعر، محمد نصیر زندہ	25 تا 26
5	ہائیکو	خاور اعجاز، آفتاب خان	27 تا 28
6	زیر سرپرستی گوشہ خالد احمد	انتخاب احمد ندیم قاسمی، یوسف حسن، محمد کاظم، حمید نسیم، خورشید رضوی، ضیا جالندھری	29 تا 32
		شاعری خالد احمد	33 تا 47
7	افسانے	فرخندہ شمیم، وسیم جبران، حمزہ حسن شیخ، ناز اوکاڑوی عمران شاہد، نعمان منظور	48 تا 79

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، اعجاز کنور راجہ تسیم سحر، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، راحت سرحدی اقبال سروبہ، قیوم طاہر، افتخار شاہد، رضا اللہ حیدر، شوکت محمود شوکت اکرم ناصر، عقیل رحمانی، افروز رضوی، سعد اللہ شاہ، غافر شہزاد ابوطالب انیم، عابد خان عابد، رخشندہ نوید، افتخار الحق، طلعت شبیر حامد یزدانی، اعجاز روشن، اجمل اعجاز، محمد افضال انجم، نبیل احمد نبیل فیض رسول فیضان، عزیز عادل، آفتاب خان، نوید عاجز، سرور فرحان علی رضا احمد، اعجاز دانش، مظہر امام، خالد وانور، ہمایوں پرویز شاہد میتھیو محسن، سمیع اللہ عرفی، شاہد ماکلی، تنویر قاضی، شریف ساجد علمدار حسین، محمد سلیم ساگر، ظہور چوہان، انوار انجم، الماس شبی محمد اشفاق بیگ، نبیل قیصر، شاہ روم خان ولی، صغیر احمد صغیر اکرم جاذب، راجہ عبدالقیوم، اسد رضا سحر، نائلہ راٹھور، اصغر علی بلوچ عاصم اعجاز، محمد کلیم، امر مہکی، احمد مسعود قریشی، قمر نیاز، عابد رضا اورنگزیب حسام حر، رانا خالد قیصر، خالق آرزو، جیا قریشی، مسکان گل محبوب خان اصغر، کوکی گل، عبدالروف زین، تابش خواجہ آبادی ملک شفقت اللہ شفی، کنور امتیاز احمد	80 تا 153
9	مضامین	جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، جمیل احمد عدیل سعید اشعر، اختر شمار، ارشد محمود ارشد، محمد افتخار شفیع سعید ارشد، ظفر اقبال ظفر، ریاض ندیم نیازی، حسیب اسیر شاد محمد سبطین شاہجہانی، تنویر قاضی، کومل شہزادی، تصور اقبال سید جمال زیدی، زہرا جمال	154 تا 220
10	طنزومزاح خاکہ	عمار نعیمی	221 تا 223
11	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، سید افسر ساجد رخشندہ نوید، فیاض تحسین، اکرم سحر فارانی، تنویر قاضی طلعت شبیر، سمیع اللہ عرفی، مسعود احمد، امجد بابر، نائلہ راٹھور سید تیمور کاظمی، محمد عبداللہ، عاصم بخاری	224 تا 241

حمد

آگ بھی اس کی دھواں اس کا شرارے، اس کے
ماہ افلاک پہ سورج یہ ستارے، اس کے

اس نے ہی بخشی ہے عیش اور نشاط انساں کو
اور ہیں جتنے یہاں درد کے مارے، اس کے

گاڑ رکھے ہیں پہاڑ اس نے سرِ سینۂ ارض
دشت و صحرا ہوں کہ دریا کے کنارے، اس کے

گل، مہکنا ہو تو، لیں پہلے اجازت اس کی
ہیں ان آنکھوں کے لیے جملہ نظارے، اس کے

ہے جو بھیجا تو پلٹنا ہے اسی کی جانب
اس کے بنئے یا نہیں، ہیں سبھی سارے، اس کے

اس کے پابند ہیں سب، ہوں یہ زماں یا کہ مکاں
قید ہیں مٹھی میں سب وقت کے دھارے، اس کے

کون جی سکتا ہے خود اپنے تئیں دنیا میں
ہیں ہر اک ادنیٰ و اعلیٰ کو سہارے، اس کے

جو بگڑتا ہے بگڑتا ہی چلا جائے ہے
بس سنورتے ہیں وہی، ہیں جو سنوارے، اس کے

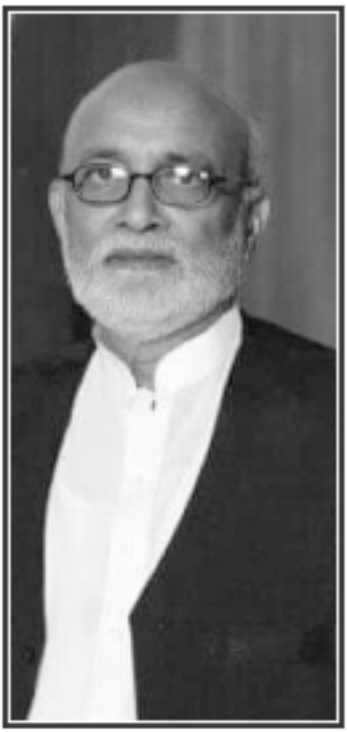

محمد افضال انجم

نعتؐ

در حبیبؐ پہ آ کے صدا لگائی ہے
وفورِ شوق سے یہ قسمت آزمائی ہے

اکھڑ چکا ہوں بہت آپؐ حوصلہ دے دیں
قدم قدم پہ ندامت ہے، جگ ہنسائی ہے

نثار آپؐ کے نقشِ قدم پہ ہوتا ہوں
مری سرشت میں یہ شوق جبہ سائی ہے

حضور آپؐ کا ہوں آپؐ لطف فرمائیں
وگرنہ مجھ پہ تو الزام نارسائی ہے

حضور آپؐ کے بدر و حنین نے مجھ کو
سکت جفاؤں سے ٹکرانے کی دلائی ہے

ریاض اتنا کیا ہے کہ نعت کہہ لی ہے
غریب شہر نے روداد دل سنائی ہے

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرے پہ سایہ گر عجب ابرِ جمیل ہے
باغِ جناں ہے پرتوِ رُخ سے بدن تمام

نعتؐ

یوں ہوا سرشارِ قلب و جگر کا فیصلہ
فیصلہ کُن ہو گیا اُنؐ کی نظر کا فیصلہ

پیش اُنؐ کے سامنے ہوں مَیں شبِ تیرہ لیے
اب اُنہی پر ہے مری شب کی سحر کا فیصلہ

مَیں تو شاید دوسری جانب ہی چل پڑتا، مگر
اُس طرف لے جائے، یہ تھا رہگذر کا فیصلہ

تنگ جب کرنے لگی اس دل کو دنیا کی کشش
کر لیا میں نے مدینے کے سفر کا فیصلہ

خیر کا پہلو ہی رہتا تھا سدا پیشِ نظر
جو بھی ہوتا تھا مرے خیر البشرؐ کا فیصلہ

شہرِ طیبہ جا کے ہی دھوئے گی اب دل کا غُبار
کر لیا تسلیم مَیں نے چشمِ تر کا فیصلہ

جتنی سانسیں ہیں انہیؐ کے نام پر لی جائیں اب
کتنا مستحسن ہے عمرِ مختصر کا فیصلہ !

کاش طیبہ میں ہی کاٹوں اپنی ہر شام و سحر
کاش کر دیں وہؐ مرے شام و سحر کا فیصلہ

میں کروں بن کر کبوتر سبز گنبد کا طواف
ہے یہی اب تو مرے بھی بال و پر کا فیصلہ

اِس یقیں کے ساتھ اُن کے در پہ جاتا ہوں نسیمؔ
میرے حق میں ہو گا میرے چارہ گر کا فیصلہ

نسیمِ سحر

نعتؐ

مِرا مقام فلک سے قریب ہو جائے
اگر زیارتِ احمدؐ نصیب ہو جائے

یہ معجزہ ہے گُلِ ہاشمیؐ کے بعد کہاں
خزاں ، بہارِ چمن کی نقیب ہو جائے

سوائے ذاتِ محمدؐ کسے ہے یہ اعزاز
خدا کی حمد کرے اور حبیبؐ ہو جائے

ہمیں حضورؐ کا اِک آسرا ہی کافی ہے
بلا سے منظرِ ہستی مہیب ہو جائے

نبھا سکے گا نہ حق نعت کا کوئی خاورؔ
اگرچہ کتنا ہی اعلیٰ ادیب ہو جائے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منہ دیکھتے ہی رہ گئے جادو بیاں سبھی
لب گنگ ہو کے رہ گئے معجز سخن تمام

نعتؐ

نبیؐ پہ جس نے درودوں کا اہتمام کیا
ملائکہ نے بھی جا کر اسے سلام کیا

میں شان سرورؐ عالم بیاں کروں کیسے
وہ جس نے عرش پہ اللہ سے کلام کیا

اور اس پہ رفعت افلاک بھی ہے رشک کناں
خدا نے اتنا بلند آپؐ کا مقام کیا

مآل ذکر رسالت مآبؐ ہے جس نے
ہم عاصیوں کو بھی دنیا میں نیک نام کیا

بنایا جب بھی وسیلہ حضورؐ کو میں نے
خدا نے نام محمدؐ کا احترام کیا

یہ ایک نعمت عظمیٰ نہیں تو پھر کیا ہے
ہمیں خدا نے حضورؐ آپؐ کا غلام کیا

کھلے ہیں اب بھی فضاؤں میں نور اور نکہت
مرے حضورؐ جہاں آپؐ نے خرام کیا

نہ ہے نہ ہوگا مثیل آپؐ کا دو عالم میں
خدا نے جن پہ نبوت کا اختتام کیا

خدا کا شکر ہوا نجم تو کس طرح جس نے
ذہن کو ذکر محمدؐ سے شاد کام کیا

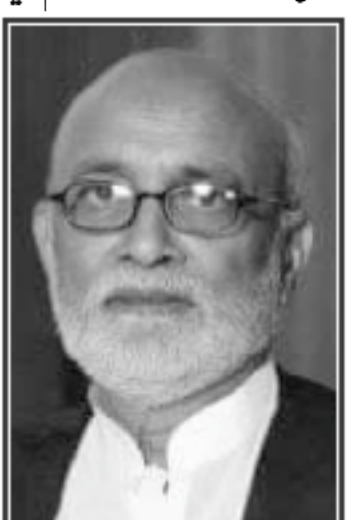

محمد افضال انجم

نعتؐ

رافت و رحمت غفار میں آ جاتے ہیں
جو نگاہ شہ ابرار میں آ جاتے ہیں

تیرگی فکر کی جب حد سے سوا ہو جائے
نعت کے حجرۂ انوار میں آ جاتے ہیں

دل شکستہ و گرفتہ سبھی بد حال و خراب
دامن رحمت سرکار میں آ جاتے ہیں

خود بخود ایک ہی در کی طرف اٹھتی ہے نظر
جب سفینے کبھی منجدھار میں آ جاتے ہیں

حبس حالات سے دم گھٹنے لگے تو ہم لوگ
"قریہ مدحت سرکار میں آ جاتے ہیں"

ذکر سرکار سے گل کاری ہوئی جاتی ہے
نقش کیا کیا در و دیوار میں آ جاتے ہیں

یوم میلاد ہے ہر ایک خوشی سے بڑھ کر
حسن سب ایک ہی تہوار میں آ جاتے ہیں

مدحت شاہ دو عالم کا ہی اعجاز ہے یہ
عام سے لفظ بھی معیار میں آ جاتے ہیں

نعت ہو جائے تو لگتا ہے کہ ہم سے گمنام
جیسے شہ سرخیٔ اخبار میں آ جاتے ہیں

ان کی سیرت کے مضامین بہ فیض مدحت
بن کے خوشبو مرے افکار میں آ جاتے ہیں

اسم احمد کے وظیفے میں عجب طاقت ہے
حوصلے بے کس و لاچار میں آ جاتے ہیں

مدح کے ساز پہ جب صل علی چھڑ جائے
سوز خود دیپک و ملہار میں آ جاتے ہیں

نعت کہتا ہوں تو افلاک سے تارے سرور
سب سمٹ کر مرے اشعار میں آ جاتے ہیں

سرور حسین نقشبندی

عقیدت

ہو دیکھنا کہ رب کی رضا کس کے ساتھ ہے
دیکھو مکینِ غارِ حرا کس کے ساتھ ہے

جو شاہِ دوسرا نے کہا بس وہی کیا
سوچا نہیں کہ خلقِ خدا کس کے ساتھ ہے

اس فیصلے کے وقت کہ ہم کس کا ساتھ دیں
یہ دیکھنا ہے ہم کو خدا کس کے ساتھ ہے

ہے کون جس کے ساتھ ہے سرکارِ دو جہاں
دیکھو میاں کہ رب کی رضا کس کے ساتھ ہے

دونوں عمر تھے ایک عطا کر دیا گیا
اس کو خبر تھی اس کی دعا کس کے ساتھ ہے

یوں بے لگام تو نہیں چھوڑا گیا ہمیں
اس رخ پہ سوچ پھر یہ بتا کس کے ساتھ ہے

اکرم ناصر

عقیدت

میں داسی تری ، باندی تری ، میں تری گولی
بلبل ہوں ترے باغ کی بولوں تری بولی

چھٹ جائیں گی مایوسیوں کی کالی گھٹائیں
ممکن نہیں خالی رہے امید کی جھولی

کچھ ابرہہ کے چاہنے والوں نے خدایا!
کھیلی ہے ترے بندوں سے پھر خون کی ہولی

قوت ہو عطا ایسی ڈریں ہاتھیوں والے
آئی ہے ترے در پہ ابابیلوں کی ٹولی

ان موتیوں کو رحمتِ بے پایاں سنبھالے
اشکوں کی محبوں نے ہے پھر مالا پرولی

اٹھیں گے رضا ہاتھ کہاں غیر کی جانب
اللہ کی عظمت ہے خیالوں میں سمو لی

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کاش کہ ان کے روپ کی دھوپ پہ سطریں چمکا دے
کاش کہ میری بے ہنری کا رکھ لیں وہ پندار

عقیدت

نبی کے ذکر سے کیا خوش کلام ہو گیا ہوں
میں دنیا بھر میں بڑا نیک نام ہو گیا ہوں

بڑے بڑے مجھے تکریم سے نوازتے ہیں
شہِ عرب کا میں جب سے غلام ہو گیا ہوں

فضائے دہر میں کیونکر نہ سر اُٹھا کے چلوں
گدائے کوچۂ عالی مقام ہو گیا ہوں

میں اپنے آقا و مولا کی پاک نسبت سے
جہاں میں لائقِ صد احترام ہو گیا ہوں

مری تلاش میں رہتی ہیں خوشبوئیں جب سے
میں وقفِ مدحتِ خیر الانام ہو گیا ہوں

جہاں سے مجھ کو سروکار کچھ رہا ہی نہیں
میں جب سے وقفِ درود و سلام ہو گیا ہوں

مظہر امام

عقیدت

مایوس کہاں مجھ سا گنہ گار ہُوا ہے
وہ بخشنے والا ہے خطا پوش بڑا ہے

ہر سمت فضاؤں میں جو خوشبو سی بسی ہے
یہ ہو نہ ہو مکّے کی مدینے کی ہَوا ہے

ہر لحظہ زباں پر ہے مِرے ذکرِ محمدؐ
ہر وقت مِرے ہونٹوں پہ بس صلِّ علیٰ ہے

یہ سارا کرم خالقِ اکبر کا ہے مجھ پر
یہ میرا قلم آپؐ کا جو مدح سرا ہے

اے کاش کہ اس قافلے میں، ہوتا مَیں شامل
جو قافلہ طیبہ کی طرف جانے لگا ہے

سردار ہیں ہر شخص کے سُلطانِ مدینہ
دیکھا نہیں، تاریخ سے ہم نے سُنا ہے

ہر ذرّہ ستارہ ہے تو ہر خار ہے گُل زار
مکّے کا یہ عالم، یہ مدینہ کی فضا ہے

وہ قدر میں، قیمت میں ہے موتی سے بھی بڑھ کر
اُس در پہ مِری آنکھ سے جو اشک بہا ہے

مَیں بھی جو غلامانِ محمدؐ میں ہوں شامل
رحمت ہے محمدؐ کی، محمدؐ کی عطا ہے

مجھ کو بھی بُلا لیں کبھی دربار میں آقاؐ
ہر وقت ندیم اب مرے ہونٹوں پہ دُعا ہے

ریاض ندیم نیازی

عقیدت

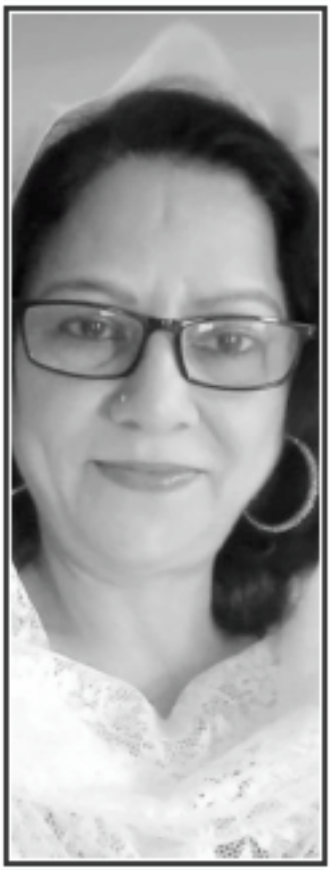

زبان و نطق کو جب نعت سے سجاتے ہیں
مرے لبوں پہ ستارے سے جگمگاتے ہیں

ثناء کے واسطے اب چاہیے ذخیرۂ لفظ
سو شہرِ علم سے کچھ رابطے بڑھاتے ہیں

پیام لائے گی اک دن صبا ہمارے لیے
چلو کہ آقا مدینے ابھی بلاتے ہیں

ہم اپنے اشک سے کشتِ ثناء کو نم کر کے
پنیری اس میں نئی نعت کی لگاتے ہیں

بس ایک ان کی شفاعت کو یاد رکھتے ہیں
پھر اس کے بعد گناہوں کو بھول جاتے ہیں

انہی کے صدقے ہوا کرتے ہیں سخن افروز
ثناء انہی کی سرِ بزم جب سجاتے ہیں

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تاب سخن تمام

عقیدت

ہیں بسی دل میں وہ سندر جالیاں
رخشاں و روشن منور جالیاں

چلتا جاتا ہوں رہ طیبہ پہ میں
ہیں مری ہر دم وہ رہبر جالیاں

چومنے آیا ہوں کتنی دور سے
میرے آقاؐ مرے سرور جالیاں

رہتی ہیں خوابوں خیالوں میں مرے
رتجگوں میں بھی معنبر جالیاں

میں جھپکتا ہی نہیں آنکھیں کبھی
تکتا رہتا ہوں برابر جالیاں

دل بہت سرشار ہوتا ہے مرا
دیکھتا ہوں جب سراسر جالیاں

بھیگا رہتا ہوں میں ان کے نور میں
ضوفشاں رہتی ہیں اکثر جالیاں

چومتا رہتا ہوں خوابوں میں جلیل
روضہء انور کی اطہر جالیاں

خوشبوؤں کے ہوں حصاروں میں جلیل
چومی ہیں جب سے معطر جالیاں

احمد جلیل

عقیدت

جو مکے میں حریمِ کبریا ہے
مدینے میں درِ خیرالوریٰ ہے

یہ کعبہ ہے تو وہ کعبے کا کعبہ
بڑا دونوں کا اُونچا مرتبہ ہے

یہاں حج کا شرف ہوتا ہے حاصل
وہاں پر مغفرت کا دَر کُھلا ہے

سروں کی مکے میں ہے سجدہ ریزی
مدینے میں دِلوں کی سجدہ گاہ ہے

بھڑکتی آگ میں یوں کُود پڑنا
براہیمیؑ وفا کا آئنہ ہے

برائے ذبح خود کو پیش کرنا
یہ اسماعیلؑ ہی کا حوصلہ ہے

تہِ خنجر ، لٹا دینا پسر کو
پدر کی بندگی کی انتہا ہے

مدینے حاضری ہی گر نہیں دی
تو ایسے حج کا پھر کیا فائدہ ہے

قلندر نے یہ کھولا راز مجھ پر
کہ مکہ بھی مدینے کی عطا ہے

نوازے سب کو مالک اِس کرم سے
میری فیضان ، یہ دِل سے دُعا ہے

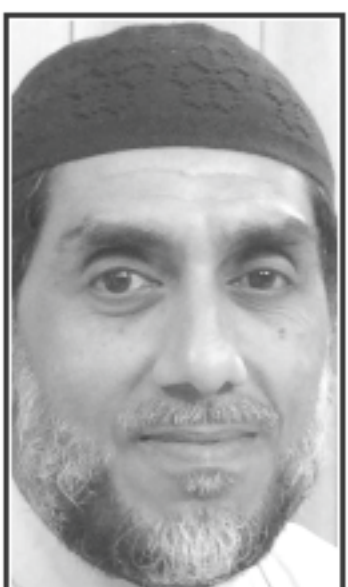

فیض رسول فیضان

عقیدت

حضور اپنا مجھے نعت خواں بنا دیجے
میں کیسے مدح سرائی کروں سکھا دیجے

حضور جالیاں یہ چومنے نہیں دیتے
حضور روضے سے شرطے پرے ہٹا دیجے

حضور آپ کے دیدار کو ترستی ہے
مری نگاہ کی تشنہ لبی مٹا دیجے

میں کون ہوں یہ نکیروں نے مجھ سے پوچھا ہے
مرا غلام ہے آقا انھیں بتا دیجے

مرا تو کوئی بھی آقا جواب ٹھیک نہیں
میں شرم سار ہوں مجھ کو کہیں چھپا دیجے

ہر اک خطیب ہی داعی ہے اپنے مسلک کا
حضور راہِ ہدایت انھیں دکھا دیجے

صغیر بن نہیں پایا جو آپ نے چاہا
حضور آپ جو چاہیں مجھے بنا دیجے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

عقیدت

عطا کرے دل و جاں کو خداء صلی علیٰ
بہ حبِ آلِ محمدؐ ولائے صلی علیٰ

درود آلِ محمدؐ بفنا نہیں کامل
بھلے پڑھے کوئی جو بھی دعائے صلی علیٰ

حسینیت ہے متاعِ درِ مدینہ علم
ہے حبِ آلِ عبا درکشائے صلی علیٰ

غمِ حسینؓ سے پاتا ہے فیض وہ کہ جسے
ملے حسینؓ سے صدق وصفائے صلی علیٰ

غمِ حسنؓ توکّل بھی ہے قناعت بھی
غمِ حسینؓ کا زر اکتفائے صلی علیٰ

غمِ حسینؓ سے ہر سحر و دخل ہے خائف
غمِ حسینؓ کلیمِ عصائے صلی علیٰ

خلوصِ زہد و ورع ہے غمِ حسینؓ کا درس
غمِ حسینؓ میں ہیں اولیائے صلی علیٰ

رہے نہ منتشر اُمت، اگر ہر اک دل میں
غمِ حسینؓ ہو اور التجائے صلی علیٰ

نیاز مند ہوں یوں ایک بارگاہ کے سب
غمِ حسینؓ سے ہے جیسے گدائے صلی علیٰ

غمِ حسینؓ ہے اُس حق حُریت کا امیں
جو ہر بشر کے لیے ہے عطائے صلی علیٰ

کہ جان و مال کا، عزت کا جو محافظ ہو
حسینیت کا وہ مسلک سکھائے صلی علیٰ

وہ تشنہ رہ کے بھی تھے کربلا میں کب تشنہ
کب جن کے ساتھ ہو فیضِ سقائے صلی علیٰ

وہ تشنہ رہ کے بھی تھے کربلا میں کب تشنہ
کہ جن کے ساتھ ہو فیضِ سقائے صلی علیٰ

کسی فرات کے وہ تشنگاں ہیں کب محتاج
کہ جن کی پیاس کو خود سے بجھائے صلی علیٰ

ہو کربلا کہ فلسطین حق کی ہر آواز
نہ دب سکے گی کہ حق ہے صدائے صلی علیٰ

حسینیت کی فضا سے ڈر اِس لیے ہے اُنھیں
حسینیت ہے نسیمِ و صبائے صلی علیٰ

حسینؓ وارث ختم الرسلؐ ہیں، یہ بھی سنو!
حسینیت ہے در مرحبائے صلی علیٰ

کتاب وسنت وعطرت، امامت واُمت
ہے زیست پر کرم بے بہائے صلی علیٰ

شہیدِ نصرتِ اسلام پر ہوں لاکھوں سلام
اسی کے نام فروغِ نوائے صلی علیٰ

نماز نیند سے بہتر ہے اور نماز بھی یوں
کہ غمِ حسین کا دے کر جگائے صلی علیٰ

نماز سجدۂ شبیر کی معیّت میں
ہے میر قافلۂ اقتدائے صلی علیٰ

بڑھائی سجدۂ شبیر نے نماز کی شان
کہ ہے نماز ہی نسبت فزائے صلی علیٰ

غمِ حسینؓ ہے وہ ماتمی سرورد بس آج
کہ جیسے ہر کوئی سازوں پہ گائے صلی علیٰ

یزید سے بھی مراسم حسین کو بھی سلام
دلِ نفاق میں کیسے؟ سمائے صلی علیٰ

غمِ حسین ہے نوحہ پر اصل میں آصف!
غمِ حسینؓ ہے مدحت سرائے صلی علیٰ

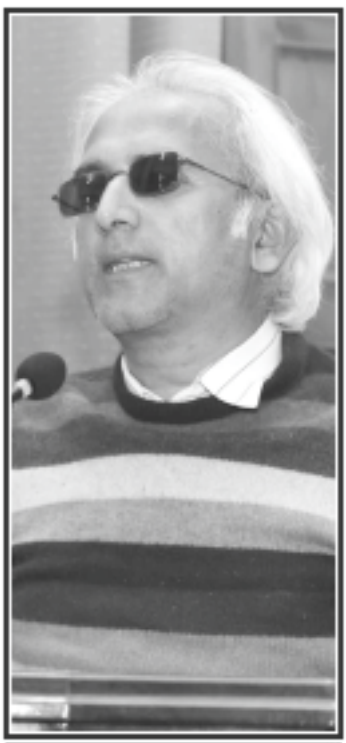

مرزا آصف رسول

عقیدت

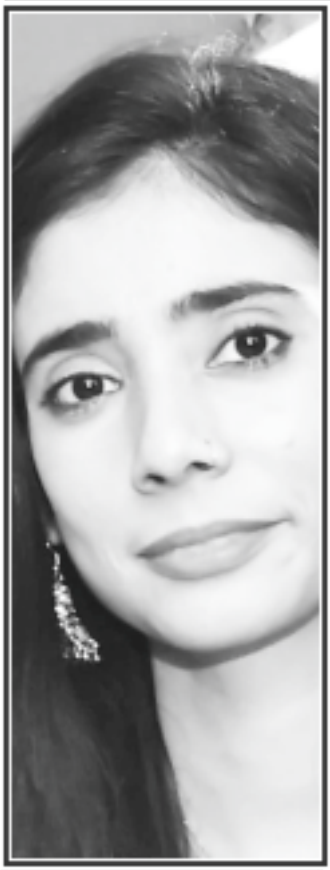

جب کبھی اُنؐ کا نام لیتی ہوں
بڑھ کے رحمت کا جام لیتی ہوں

جب کبھی ڈگمگائیں میرے قدم
اُنؐ کے دامن کو تھام لیتی ہوں

آپؐ کی آل ہی کا صدقہ ہے
رزق جو صبح و شام لیتی ہوں

روشنی بھی سلام کرتی ہے
جب محمدؐ کا نام لیتی ہوں

نعت کے شعر جب لکھوں میں عمود
جذبِ اُلفت سے کام لیتی ہوں

عمود ابرار

انتخاب

خالد احمد

اے ماحیِ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رُسلِ ذوالمنن تمام

نعمان منظور

عقیدت

عبادت ہے مری ہر دم علی کا پیار سینے میں
چھپا ہے خلد کا گویا کوئی گلزار سینے میں

بنے گا نورِ ایماں حشر کے دن مہر و الفت کا
لگا رکھا ہے ہم نے جس کا اک انبار سینے میں

نہ ڈر ہے موت کا ہم کو نہ خوفِ روزِ محشر ہے
کہ ہے شاہِ نجف کی ذات کا اقرار سینے میں

علی کے ذکر سے ملتی ہے تسکیں قلبِ مضطر کو
ہوئے روشن اسی سے معرفت کے تار سینے میں

ہیں لرزاں آج بھی خیبر قلعہ کی برجیاں نعمان
بسا ہے وہ دلاور، حیدرِ کرار سینے میں

نعمان منظور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گُل کِھل رہے ہیں کھلتے سُروں کی اٹھان سے
نقشِ قدم ہیں یاسمن و نسترن تمام

رباعیات

جیسے بھی ہیں اموال حفاظت میں رکھو
میلے ہیں اگر گال، حفاظت میں رکھو
رہنا ہے جہاں رہنے کے آداب بھی ہیں
چاہے ہو وہ پاتال حفاظت میں رکھو

اغیار کی دوستی پہ تکیہ کم ہے
تاریکی میں روشنی پہ تکیہ کم ہے
اب وقت بہت کم ہے، زیادہ ہے کام
اس موڑ پہ زندگی پہ تکیہ کم ہے

پھر تازہ ہوا زخم پرانا دل کا
واپس نہیں آئے گا زمانہ دل کا
میں خود کو ہواؤں میں اڑاتا پھرتا
اعزاز تھا تجھ پر کبھی آنا دل کا

انعام کی قیمت نہیں دیکھی جاتی
اصنام کی قیمت نہیں دیکھی جاتی
ملتا ہے جو محبوب کی جانب سے کبھی
پیغام کی قیمت نہیں دیکھی جاتی

خطرات کی صورت نہیں دیکھی جاتی
عشاق کی قسمت نہیں دیکھی جاتی
پانی میں اتر کر کبھی بھولے سے بھی
سیلاب کی حالت نہیں دیکھی جاتی

حالات سے ڈرنا مرا معمول نہیں
اقساط میں مرنا مرا معمول نہیں
اشکوں کے سہارے کبھی قطرہ قطرہ
تالاب کو بھرنا مرا معمول نہیں

جیون میں محبت کا سبق سیکھا ہے
دھیرج سے قیامت کا سبق سیکھا ہے
روکا نہیں ہے خود کو کہیں رستے میں
اس جسم سے ہجرت کا سبق سیکھا ہے

حالات کو سہتے ہیں خلافِ عادت
چپ چاپ ہی رہتے ہیں خلافِ عادت
مجھ کو کسی جادو کا اثر لگتا ہے
سیلاب میں بہتے ہیں خلافِ عادت

سعید اشعر

رباعیات

صورت کو حجابِ رخِ جاناں کرنا
کیا خوب ہے موجود کو پنہاں کرنا
آئینہ ترا رنگِ تماشا پہنے
بے رنگ کرے حسن کو عریاں کرنا

.....

تصویر ہے دید کی پشیمانی میں
آئینہ دیکھتا ہے حیرانی میں
تو رکھ دے بدن اتار کے ایک طرف
میں دیکھوں تجھے پردۂ حیرانی میں

.....

اونچا نہیں ہوں طرۂ دستار سے میں
اٹھا ہوں فرازِ رسن و دار سے میں
میں سازِ جنوں میں نغمۂ عشق فریب
مارا گیا ہوں اپنے ہی وار سے میں

.....

خورشید قبا پتنگ سے آگے چلیں
ضو بار غبارِ سنگ سے آگے چلیں
بیدار کریں دریچۂ خواب کی لو
آؤ کہ جہانِ رنگ سے آگے چلیں

.....

دیوار کو ہم رقصِ تماشا کر دوں
اعجاز سخن سنگ میں پیدا کر دوں
تصویرِ تمنا نہ کروں عشق کو میں
مجنوں کو حجابِ رخِ لیلیٰ کر دوں

ساغر کو سفیرِ من و تو کون کرے
چشمِ ساقی سے گفتگو کون کرے
میں عیشِ غمِ نشاط میں روتا ہوں
حسرت کو لباسِ آرزو کون کرے

.....

پیمانۂ جان تشنۂ لیلائی ہے
خود حسن بھی دیدۂ تماشائی ہے
تصویرِ قبا حسینۂ دید فروش
کس گلشنِ پیرہن کی زیبائی ہے

.....

بازارِ دید میں خسارا ہی سہی
سودا نہ سہی رزقِ تمنا ہی سہی
میں چہرۂ معشوق پہن لیتا ہوں
مصنوعی عشق کا تماشا ہی سہی

محمد نصیر زندہ

ہائیکو

پاؤں رکھا نہ احتیاط کے ساتھ
پھول کا ہاتھ چھوڑ کر خوشبو
گر پڑی ہے ہوا کی سیڑھی سے

.....

دِل کے پنجرے میں اور کچھ بھی نہ تھا
مَیں نے کھولا تو پھڑ پھڑاتی رہی
دیر تک ایک حسرتِ پرواز

.....

سر پہ تانے سحاب کی چھتری
اور آنکھوں پہ دھوپ کا چشمہ
خواب تکتا ہُوں آبشاروں کے

.....

اُڑ جاتا ہے رنگِ ہستی
آنکھوں کے پنجرے میں آخر
اِک حیرانی رہ جاتی ہے

.....

خواہش کے قیدی ہیں سارے
باہر کی دُنیا چڑیا کو
پنجرے سے چھوٹی لگتی ہے

خاور اعجاز

ہائیکو

سنسناتی ہوا میں گُل مہکے
رنگ شاخوں کا سبز سبز ہوا
جو تھے پنچھی اُداس ، وہ چہکے

.....

تیرتے تھے ندی میں پھول کئی
ہمیں اپنے پہ خود ترس آیا
پاؤں جب چھو گئے ببول کئی

.....

پھر پرندوں کی گنگناہٹ ہو
پھر درختوں کو دے دیا پانی
تاکہ آنگن میں چہچہاہٹ ہو

.....

آگیا دل عجیب ہلچل میں
ہم پہ قوسِ قزح بکھریں گے
رنگ جتنے ہیں اُس کے آنچل میں

.....

آنکھ کے منظروں میں قید کیا
کیا یہ کم انتظار کی حد ہے
اُس کی خاطر پہ سَر سفید کیا

.....

گیسوؤں کا بدن سنہرا ہے
دل میں جذبے ت کے رقص کریں
کتنا معصوم اُس کا چہرہ ہے

کِھل اُٹھے دل میں سرخ لالہ زار
چمپئی رنگ اُس دوپٹے کا
پھیلتا جا رہا ہے رنگ کی دھار

.....

رنگ ، خوشبو دھنک ستارے ہیں
تجھ کو چھونے سے ہم پہ راز کھلا
تیری جانب سبھی اشارے ہیں

.....

تنگ آیا ہوں سرد آہوں سے
فرد کا اعتبار ختم ہوا
اُٹھ گئی ہے حیا نِگاہوں سے

.....

چن رہے ہیں گلاب ہاتھوں میں
زندگی خار خار ہو نہ کہیں
چاہیے بس کتاب ہاتھوں میں

آفتاب خان

خالد احمد کی شاعری پر مختصر آرا

.....احمد ندیم قاسمی.....

سوچ رہا ہے، کسے پکارے، گلی گلی ویران
کب تک شہر کا بوجھ سہارے کھنڈر کھنڈر انسان

دکھ انگور کی بیلیں ہیں، یہ بیلیں پھلنے دو
سکھ کے پل بھی کھنچ آئیں گے، سورج ڈھلنے دو

.....

یہ باتیں کسی نے ہماری زبان میں آج تک نہیں کہیں اور نہ یہ لہجہ اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں آیا۔ یہ ملاپ دو بہت تیکھی، بہت انوکھی لہروں کا ہے اور جب یہ مل کر ایک وحدت بن جاتی ہیں تو ایک بالکل نادیدہ جمال، حساس قاری کے رگ و پے میں رچ جاتا ہے۔ پنجابی میں اس Pathos کے ساتھ اُستاد میاں محمد بات کرتے تھے۔ سلطان باہو بھی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ تصوف ہماری سرزمین کا ہے اور اردو میں ایک نئی بہار لے کر آیا ہے..... تازہ ببول کے زرد پھولوں کی جن میں سوندھی مٹی کی مہک بھی ہے۔

میں ہمیشہ بڑی سطح پر ندرت کا جمال دیکھنے کا خواہاں رہا ہوں۔ جدید تر اردو شاعری ابھی تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہی تھی۔ اب خالد احمد، ہزاروں جگنو اپنی فکر کی شفاف ردا میں بھر لایا ہے اور یہ جھل مل مجھے بہت اچھی لگی۔ میں اب صرف وصیت کر سکتا ہوں اور ساتھ دعا۔ خالد احمد صاحب کو اب اس خاص روکا ہو کر رہ جانا چاہیے۔ یہی دنیا کے Love of Being کی ہے۔ میں نے ابھی تک ان کا اور کلام نہیں دیکھا کہ یہاں کا اردو بازار جل گیا تھا۔ ویسے بھی اب کتاب گھروں میں جا کر کتاب ڈھونڈنا میرے بس میں نہیں رہا۔ لیکن جو دیکھا اس سے ان کا وجدان پوری طرح میرے سامنے آ گیا ہے۔

یہ باتیں میں نے دل کی تمام تر صداقت سے کی ہیں۔ میں نے آج تک کسی کو کوئی ادبی مشورہ نہیں دیا کہ مجھے اپنی عاجزی اور بے توفیقی کا ہمیشہ علم رہا ہے۔ مگر میں عالمی ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ضرور ہوں۔ میں خام اور کندن میں امتیاز بھی کر سکتا ہوں۔ میری یہ گزارش اس امکانی طور پر Major Poet تک پہنچا دیجیے۔ وہ خود منفرد شعور رکھتے ہیں۔ جو راہ وہ چلنا چاہیں وہ ان کے لیے بابرکت ثابت ہو۔'

.....یوسف حسن.....

خالد احمد بڑے آدرشوں کے ساتھ جینے والا ایسا جدید شاعر ہے جس کے ہاں ذہنی اور حسی انبساط

ایک ساتھ فراہم کرنے والی شاعری کی مقدار تنوع، توسع اور ترفع کے ہمراہ مسلسل اضافہ پذیر ہے اور اس اضافہ پذیری میں آہستہ روی کے باوجود اس کے زورِ طبع کی کسی آخری حد کا تعین ممکن نہیں، بس یہی ہے کہ ہمیں اس کے زورِ طبع پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنی توقعات کے نشانات بلند سے بلند تر درجے پر لے جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے کہ وہ کل یقیناً وہاں نہیں ہوگا جہاں ''تشہیب'' ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' اور ''پہلی صدا پرندے کی'' کے بعد اب ''ایک مٹھی ہوا'' میں نظر آیا ہے۔

.....محمد کاظم.....

نعت نگاری میں ایک نازک اور پُرخطر مقام وہ ہوتا ہے جب شاعر مدحِ نبیؐ کرتے ہوئے اپنا جذباتی توازن برقرار نہیں رکھ سکتا اور آپؐ سے وہ صفات منسوب کرنے لگتا ہے جو خود آپؐ نے اپنے ساتھ کبھی منسوب نہیں کیں۔ یہ ایسی پھسلن ہے جس سے بڑے بڑے شعراء بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکے۔ مقام طمانیت ہے کہ خالد احمد نے اپنے ان تینوں قصیدوں میں ہوش مندی اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جہاں اسے بھٹک جانے کا ذرا سا بھی خدشہ ہوا ہے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے۔ اس کا ایک نمونہ خود اس کی زبان سے سنیئے:

آپ ہیں غرب جنوب
آپ ہیں شرق شمال
بس بس اے گستاخ
چپ اے شہد مقال
رنگ میں رنگ ملا
بات سے بات نکال
مدح کو حمد نہ کر
آگ میں ہاتھ نہ ڈال

.....حمید نسیم.....

خالد احمد آج کا، اسلامی تصوف کا داعی شاعر، اللہ سے اپنے آقا کے تصدق، ایک نئی دنیا کی تشکیل کی بھیک مانگتا ہے۔ جہاں نوع انسانی ایک وحدت ہوگی۔ عدل و احسان کے اصول پر مبنی عالمی معاشرہ ہی نوع انسانی کے سفر کی تکمیل ہے۔ ہمارے مستقر الٰہی عین کا IDEAL یہاں دلوں اور زبانوں میں ہم آہنگی ہوگی۔ رانجھا، سانول، اللہ، رب، رحیم، رحمان سب ایک ہی محبوب کے نام اور اس کی شانیں ہیں اور اس اللہ کے ماننے والے فقیر قافلہ وحدت انسانی کے ساربان ہیں،

دل بہ یار، دست بہ کار

یہ میرے نزدیک خالد احمد کے فکر و خیال، جذبہ و جدان کی اصل دنیا ہے۔ وہ کیسا باکمال، کیسا نادر اسلوب رکھنے والا لفظوں کا صورت گر ہے؟ یہ آپ نے ان مثالوں سے دیکھ لیا۔

میں سمجھتا ہوں خالد احمد کا اصل پرایہ اظہار یہی ہے جو ''ماد ھولال حسین کے لیے'' میں اس حسن، اس مہکتے، تجمل سے، دل کو اپنی نرم حریری گرفت میں لے لیتا ہے۔ اب تک خالد احمد نے جو لکھا ہے اس کی بنا پر وہ ہر اعتبار سے جدید تر نظم و غزل کا منفرد نمائندہ ہے۔ خدا اسے طبیعی عمر تک صحت و سلامتی کے ساتھ پہنچائے تو ابھی اس کے پاس کم از کم دو اڑھائی عشرے اور ہیں۔ وہ امکانی طور پر ہماری نئی قومی زبان کا پہلا بڑا شاعر ہے۔ وہ نئی قومی زبان جو اردوئے معلیٰ اور سرائیکی بولی کا آمیزہ ہوگی یعنی میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب اور مرزا داغ کی رواں اردو اور سلطان باہوؒ اور بلھے شاہؒ کی شعری فرہنگ کا آمیزہ۔ اس آمیزے نے خالد احمد کے وجدان میں پوری جگہ بنالی ہے، ایک مکمل زبان کی حیثیت سے!

.....

.....خورشید رضوی.....

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تُو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

.....

خالد احمد گہرے مذہبی احساسات رکھتے تھے مگر بڑے اعتدال، فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ۔ عشق رسولؐ اور محبت اہلِ بیتؑ سے سرشار تھے۔ اُن کی نعتیں اور سلام اس کے شاہد ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنا مجموعۂ نعت، 'تشبیب' ہی شائع کرایا۔ 'نم گرفتہ' میں اُن کی ایک طویل نعت اُن کے جذبے اور فنی کمال دونوں کی آئینہ داری کرتی ہے:

اک سطر میں ہوئے ورقِ جان و تن تمام
لیکن ہوا نہ تذکرۂ پیرہن تمام
کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تاب سخن تمام

مٹی سے مَس ہوئی وہ سرانگشت آفتاب
یکسر گلاب رُو ہوئے نسرین تن تمام

خالد احمد کی مذہبی شاعری محض کارِ ثواب میں قافیہ پیمائی نہیں ہوتی۔ اُن کے خون کی حدت و حرارت اُس میں بولتی ہے اور اُن کی تازگیٔ نظر، اچھوتے اسلوب اور تازہ مضامین کی راہ نکالتی ہے۔ حمد کے چند شعر دیکھیے:

ربِّ گل! ربِّ رنگ! ربِّ بہار!
ایک نقش اور، ربِّ نقش و نگار!

وسعتِ کائناتِ عشق دِکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

کس لیے ارد گرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ در و دیوار

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

خالد احمد باکمال انسان تھا مگر اپنا کمال دوسروں پر ٹھونستا نہیں تھا۔ وہ دوسروں کا اثبات زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ اُس کی شخصیت اور اُس کے فن، دونوں میں بڑا تنوع تھا۔ وہ اپنے گردوپیش کا شعور بھی رکھتا تھا اور اپنے اعماقِ ذات میں بھی اُترتا تھا۔ علم طبیعیات [Physics] اُس کا تعلیمی اختصاص رہا اور ادب اُس کا اوڑھنا بچھونا۔ غزل، نظم، قصیدہ، کالم رسالے کی ادارت، ٹی وی سکرپٹ، ادبی انجمنوں کی جان بنے رہنا اور نئے لکھنے والوں کی رہنمائی و حوصلہ افزائی، سب کام اُس نے بڑی سہولت اور بڑی عمدگی سے انجام دیئے۔

.....

.....ضیا جالندھری.....

خالد احمد نے اپنے لیے جو شعر کی دُنیا تخلیق کی ہے، وہ کئی وجوہ کی بنا پر حیرت انگیز ہے۔ اُسے فنِ شعر میں جو مہارت تامہ میسّر آئی ہے وہ کسی کسی خوش قسمت کے ہاتھ آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ فیضان بے پناہ ریاضت، خلوص اور انہماک کے بغیر ممکن نہ تھا، بلاشبہ خالد احمد ایک صاحب اسلوب شاعر ہے۔ اُس کی تخلیقات کے مطالعے سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک فنا فی الشعر ہے۔ خالد احمد نہ صرف لفظ کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا ہے بل کہ اسے پوری احتیاط اور کمال کے ساتھ برتا بھی ہے۔ اُس کی تحریری اُس کے جوہر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

خالد احمد نے جب شعر کہنا شروع کیا ہے تو اس وقت ترقی پسند ادب کی تحریک کا اور جدید ادب کے مدرسۂ فکر کا زور و شور کچھ مدّھم پڑ چکا تھا۔ ان تحریکوں کے بعد بھی اردو ادب میں کچھ دوسری تحریکیں نمودار ہوتی رہیں مگر انھوں نے وہ اہمیت حاصل نہ کی جو ان دو تحریکوں کو اپنے زمانے میں ملی تھی، خالد احمد ان تحریکوں سے کماحقہٗ آگاہ بھی تھا اور اُس نے ان تحریکوں سے استفادہ بھی کیا ہے مگر وہ ان میں سے کسی ایک کا ہو کر نہیں رہا اُس نے اپنی الگ انفرادیت قائم کی وہ اپنی سرزمین اور اپنے کلاسیکی روایتوں میں اتنا رچا بسا تھا کہ اُسے باہر سے آئی ہوئی کوئی تحریک بھی بہا کر نہ لے جا سکتی تھی اُس کی شاعری کے کئی رنگ اور اُس کی کئی پرتیں ہیں، جن میں سب سے نمایاں رنگ وہ ہے جو اُس علاقے کے تصوف سے اُبھرتا ہے، جس میں اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں، جس رنگ کو اُس کی حُبِّ خدا اور حُبِّ رسولؐ نے نکھار دیا یہاں کی اسلامی روایات اور تہذیب کو اُس نے اپنی تخلیقات کا مرکزی نکتہ بنا لیا۔

☆☆☆☆☆

غزل

دَف بھی تھی نوحہ نشاں، نغمہ بھی نالہ تھا مرا
عجب آہنگِ گلوگیر حوالہ تھا مرا

رُوح دہکائی مری، فکر بھی پگھلائی مری
آنچ دے دے کے نیا رُوپ نکالا تھا مرا

ہجر آغشتہ محبت مجھے نم رکھتی ہے
یار سمجھے تھے، بدن سوکھنے والا تھا مرا

پھل پڑیں یا نہ پڑیں، پیڑ جڑیں چھوڑیں گے
پا بہ گل مجھ میں بھی اک چاہنے والا تھا مرا

قافلہ وسطِ بیابانِ زیاں آ نکلا
اے حُدی خواں! سفرِ زیست نرالا تھا مرا

سبھی آنکھیں مری آنکھوں کی طرح خالی تھیں
کیا کہوں؟ کون یہاں جاننے والا تھا مرا

وہی غم تھا، وہی شامیں تھیں، وہی ڈورے تھے
وہی مَے تھی، وہی مَیں تھا، وہی چالا تھا مرا

مجھے پڑھنا ہے تو بیٹھو، مجھے پڑھ کر اُٹھو
کوئی مجموعہ کہیں تھا، نہ رسالہ تھا مرا

مجھے دیکھو، مری آنکھیں، مرے آنسو دیکھو
اِس اَماوس میں بھی مانوس اُجالا تھا مرا

دُکھ تو یہ ہے کہ اُسے دُکھ ہی ملے ہیں، جس نے
غم سنبھالے تھے مرے، گھر بھی سنبھالا تھا مرا

صورتِ ریگِ رواں غرقِ سفر تھا خالدؔ
ہم قدم میرا، فقط پاؤں کا چھالا تھا مرا

خالد احمد

غزل

صبح عروج کی راہ نہ لگنا، شام زوال نہ کرنا
عشق سفر کرنا، لیکن سورج کی چال نہ کرنا

اپنے عکس نگاہ میں رکھنا میرے آئینے میں
مست تم اپنی دھن میں رہنا میرا خیال نہ کرنا

میری بات پہ میری کوئی بات نہ یاد دلانا
مجھ کو جیتنے آنا لیکن نطق کو جال نہ کرنا

ہنستے ہنستے کہہ جاتے ہو، تم بھی ساری باتیں
میرے وار پہ اپنے آگے میری ڈھال نہ کرنا

اشک غزال بھڑک اُٹھے تو کس صحرا جا نکلیں
یہ دل اک وحشت کا گھر ہے، یہ پامال نہ کرنا

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کر

خالد احمد

غزل

خوف مجھے آتا ہے، اِس یکتائی سے
آؤ گلے لگ جاؤ مری تنہائی سے

تم کیا جانو؟ میں نے کیا کچھ دیکھا تھا
وہ کیسا ہے؟ پوچھو، مجھ سودائی سے

ہجر کی چھاؤں سونے والے کیا بتلائیں
پیڑ کو پیڑ کیا ہے، کس دانائی سے

اِک ہرجائی چاہ، مری پہچان بنی
دامن کیسے چھڑاؤں اِس ہرجائی سے

پیار کنارے عمر گزار کے شام ڈھلی
ربط فقط رُسوا کا رہا، رُسوائی سے

کوئی زلیخا کیا جانے، یہ بھید یہ بھاؤ
بھائی کا بھاؤ پوچھ بکاؤ کے بھائی سے

اِس سر کا سودا کب سر لے جائے گا؟
کبھی یہ پوچھو اپنی دل آرائی سے

مجھ کو کھوجو آپ اپنی پہنائی میں
مجھے نکالو کاغذ کی گہرائی سے

چاند چراغِ طاقِ گدا ہے، اے خالدؔ
دیکھو مری کٹیا قصرِ دارائی سے

خالد احمد

غزل

اے دامنِ نگاہ! وہ دھبا نہیں رہا
اِس دشت میں اِک آبلہ پا تھا، نہیں رہا

دنیا نے اُس کو رنگ لیا اپنے رنگ میں
اٹھ، اے سرِ نیاز! وہ یکتا نہیں رہا

رُسوا نہ ہو، غبارِ نواحِ دیارِ دل!
اُس کی گلی میں بھی کوئی اُس سا نہیں رہا

کوئی غزل نگاہ، غزل رُو، غزل گلو
وجہِ ہجومِ اہلِ تماشا نہیں رہا

اے اہلِ غم! وہ سایۂ دیوار اُٹھ گیا
پہلا سا شہرِ دل کا بھی نقشہ نہیں رہا

پہلے سے دوست ہیں نہ وہ پہلے سی دوستی
کس سے کہیں کہ شہر میں کیا کیا نہیں رہا

پیڑوں کے مول بک گئے چڑیوں کے غول بھی
کیا ظلم ہے کہ ظلم کا چرچا نہیں رہا

بے چین شام سے ہیں اَبابیل کی طرح
کعبے کے رُخ اڑان کا یارا نہیں رہا

کب منزلِ مراد وہ رنگِ سخن نہ تھا
کب مرکزِ نگاہ وہ چہرہ نہیں رہا

اے نم نگاہ! یہ نمِ مژگاں کی آب ہے
شایانِ آسماں کوئی تارا نہیں رہا

دل میں غبار ہونے کی طاقت نہیں رہی
نس نس جو دوڑتا تھا، وہ پارا نہیں رہا

خالدؔ وہ طبل و نَے، وہ حدی خواں نہیں رہے
یہ قافلہ بھی زمزمہ آرا نہیں رہا

خالد احمد

غزل

کچھ جدائی کے دامن میں بھی چھوڑ دیں
ربط رکھیں، اگر دوستی چھوڑ دیں

ہنستے ہنستے اچانک اُٹھیں، چل پڑیں
میز بھی، دوست بھی، شہر بھی چھوڑ دیں

کس پڑاؤ پہ، کس موڑ پر، کس گھڑی؟
اَدھ کہی داستاں، اَدھ کہی چھوڑ دیں

گل مہکتے، پرندے چہکتے رہیں
اور ہم اہلِ غم، شاعری چھوڑ دیں؟

چھوڑ دیں آس بھی؟ حسن کی پیاس بھی؟
پونچھ لیں چشمِ تر؟ عاشقی چھوڑ دیں!

سُرخ دینار اہلِ نظر چھان لیں
راست دل کے لیے راستی چھوڑ دیں

دُکھ کہاں جائیں گے، سکھ کہاں پائیں گے
کس طرح ہم اب اُن کی گلی چھوڑ دیں

ہر روش اک گلِ گرد کا تخت ہے
راہِ صحرا وہ کیوں کر تہی چھوڑ دیں

شہر، غولِ بیاباں کے بھٹ ہو گئے
گھر بنانا نہ اب آدمی چھوڑ دیں

کس بلندی کو دیں وہ سر افرازیاں
پست کتنے علم وہ یونہی چھوڑ دیں

زخم ملنے کی خو، پھول کھلنے کی خو
کس طرح، چشمِ نم! عاجزی چھوڑ دیں

باغ ٹھہرے یہ سیرِ عدو کے لیے
گر کچھ اہلِ وطن سرکشی چھوڑ دیں

پانچ دریاؤں کا نطق کس کو ملا
کیا ہم اِس بات پر فخر بھی چھوڑ دیں؟

اے فقط نغمگی! اے فقط تازگی!
چھوڑ پائیں تو دریا دلی چھوڑ دیں

خالد احمد

آج کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا

خالد احمد

لو! وہی فیصلے کا دن آیا
لوگ کتنے ہرے درختوں کو
روز چولہوں میں جھونک دیتے تھے
مجرمو! یہ وہی جہنّم ہے
تم نے ہر شام جس کو جھٹلایا

لو! وہی فیصلے کا دن آیا
کوئی ہم پنجروں کو زندہ کرے

کوئی ان ہڈیوں کو لب دے دے
ہم کہ ہر دن کی طرح بے بس ہیں

آج پھر بے کسوں کا والی ہے
جس کو ہر شام ہم نے جھٹلایا
لو! وہی فیصلے کا دن آیا

یہ خالی جگہ پُر نہ ہوگی

یہ خالی جگہ حشر تک پُر نہ ہوگی
لحد کے کنارے اِک انبوہِ دل دادگاں ہے
کدالیں، لحد سے پرے، محوِ آرام ہیں
خاک کی مٹھیاں آخری قرض ہیں
بیلچوں سے لحد پر چڑھائی گئی
چادرِ خاک کی سلوٹیں دُور کی جا رہی ہیں
کہ 'ہونا'، 'نہ ہونا' برابر کیا جا رہا ہے
مگر یہ خلا پُر نہ ہوگا
کہ 'ہونا'، 'نہ ہونا' کسی سے برابر نہ ہوں گے
کہ اپنا 'نہ ہونا' تو، ہونے سے پہلے بھی تھا
اب بھی ہے، کل بھی ہوگا
سروں پر تنے آسماں کی طرح
اپنا 'ہونا'، 'نہ ہونا' برابر برابر کھڑا ہے

ہتھیلی پہ کہسارِ ناہید کے
دامنِ سبز میں زندگی کی لکیریں رواں ہیں
مگر یہ لکیریں جہاں ٹوٹتی ہیں
وہاں اک نئی چمچماتی ہوئی لوح کا جگمگاتا ہوا تاج سر پر دھرے
ایک تازہ بہ تازہ گڑھا اپنی آغوش کھولے کھڑا ہے

مگر، دولتوں، دوستوں، شہرتوں، عورتوں کے دَروں سے گزرتی
لکیروں کی گنجان گمراہیوں میں چھپا، یہ گڑھا،
غور سے دیکھنے پر بھی ہم کو بجھائی نہ دے گا

لحد چادرِ گل تلے سو رہی ہے
تہِ گور، اِک غمِ سخن ہے
سرِ گور، انبوہِ غم زادگاں ہے
'سخن پروری' گنگ ہونٹوں کے مابین ربطِ رواں ہے
'سخن دوستی' اشتراکِ الم، اشتراکِ عمل، اشتراکِ فغاں ہے
'سخن' جھوٹ سچ کے میاں، ایک خطِ رَواں ہے
تہِ گور، اِک گل سخن ہے
لحد چادرِ گل تلے سو رہی ہے

'یہ شاعر، کچھ ایسا ہی شاعر تھا
اِس کی لحد پر قیامت تلک گل کھلیں گے

'یہ لیکھک ہماری زباں کا سَرِ فخر تھا
آسماں حشر تک، صرف اس گورِ گل پوش پر شبنم افشاں رہے گا

'یہ لیکھک ہماری سیاست کا آغاز گر تھا
'ہم اس کے سخن اور اس کی زبانِ سخن کے لیے
آخری سانس تک، آخری فرد تک

آخری شہر کے' آخری گھر تلک'
اک سپاہی کے مانند جم کر لڑیں گے'
'مرے دوستو! اب ہماری زباں بھی تحفظ طلب ہے
'یہ شاعر، ذرا نرم خو، نم نمو، نم سخن تھا
'مگر ہم 'سخن ور' نہیں ہیں
'ہمارے بدن سخت ہیں' ذہن فولاد ہیں
دل نہیں 'عزم آباد' ہیں

دوستو! یاد رکھنا، ہماری محبت ہماری زباں ہے'

'سیاست گروں کی زبانیں' کدالوں کے درجے پہ فائز ہوئی ہیں
'سیاست گروں کی کدالیں رواں ہیں'
وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں
وہ ہم سے لوگوں کا ہونا نہ ہونا برابر بنا دیں

'ہماری رضا کو کھلونا بنا لیں
'ہمیں پارہ پارہ کریں' خانہ خانہ ہمیں اور تقسیم کر دیں
'ہمارے دُکھوں کی بھی تعیم کر دیں
'مفادات کی خندقیں' زندہ لاشوں سے بھر دیں
'ہمیں ایک کر دیں' ہمیں نیک کر دیں،
'سیاست گرو! یاد رکھنا
زباں کی محبت، مفادات کا پالنا ہے
سیاست گری کے تضادات کا پالنا ہے
'زباں دوستی' اہلِ غم کے میاں، ایک خطِ گماں کھینچنا ہے
'زباں پروری' گنگ ہونٹوں کے رقبوں میں
جلتی جدائی کے تپتے ہوئے دشت میں'

بغض کے خارداروں کے مرکز میں قائم شدہ' تیرۂ و تار'
زیرِ زمیں تجربہ گاہ میں اِرتقا یافتہ بیج کا ڈالنا ہے!
'زباں کی محبت' لسانی فسادات کا پالنا ہے!
'مرے دوستو! یاد رکھنا، وہ شاعر بہت نرم رُو، نرم خُو، نم نمو، نم نوا، نم سخن تھا
'وہ اِس ملک کے گنگ ہونٹوں کی فریاد تھا!
اُس کا دل عشق تھا، 'حسن آباد' تھا!
اُس کا اِک اِک سخن، در پئے ظلم و بے داد تھا!

اُس کا روئے سخن، سوئے اہلِ محن تھا!
'مرے دوستو! وہ کسانوں کی بے دخلیوں،
ہاریوں پر برستے ہوئے تازیانوں،

خواتین کی ظلم ایجادیوں!
اور سردار زادوں کی بے رحمیوں پر!
سخن رنگ زنجیر سے اپنا تن کوٹتا تھا!
مرے دوستو! اُس کے ہر لفظ سے، اُس کے اپنے بدن کا لہو پھوٹتا تھا!'
'وہ بے شک، ہماری زباں میں زباں کھولتا تھا
'مگر اُس کے ہر لفظ میں، ایک دنیا کا دُکھ بولتا تھا
'مرے دوستو! یاد رکھنا، زباں کھولنا تو فقط
گنگ لب اہلِ غم کے لیے کھولنا!
گنگ ہونٹوں کے رقبوں میں
جلتی جدائی کے تپتے ہوئے دشت کی

دھول کے پھول کی زندگی کے لیے بولنا!
یاد رکھنا! گلِ گرد کی عمر، ہم شاعروں کے
تصور کے آفاق پر جھلملاتے ستاروں کی
کل زندگی سے زیادہ رہی ہے!'
'مرے دوستو! یاد رکھنا، ہمارا سخن اُن کی آواز ہے
اور یہ گنگ لب، اہلِ غم، 'عشق آباد' ہیں!

دوستو! یاد رکھنا، زبانِ محبت، ہماری زباں ہے!
'زبانِ محبت وہ خالی جگہ ہے
کہ ہم تم، کسی شہر بھی جا بسیں
کوئی دیسی، بدیسی زباں سیکھ لیں

یہ خلا، ہم، کسی بھی زباں سے
کبھی پُر نہیں کر سکیں گے!'

'یہ خالی جگہ' عشق ہے،
یہ خلا، حشر تک پُر نہ ہوگا!
'سیاست گروں کی کدالیں ہوا پھاڑتی ہیں،
'خلا کاٹتی ہیں،
'زمیں چاٹتی ہیں
'ہمیں بانٹتی ہیں
'مگر اِس سیاست کے میداں میں بھی اِک گڑھا ہے
جسے اہلِ غم رات دن پاٹتے ہیں!
'یہ خالی جگہ، فسق ہے،
بے نواؤں سے یہ حشر تک پُر نہ ہوگی!
'ہمیں اہلِ غم کی ضرورت ہے اور آج ہم
ایک اور اہلِ غم کھو چکے ہیں!
یہ خالی جگہ، درد ہے،
یہ خلا حشر تک پُر نہ ہوگا!

خالد احمد

محبت! ایک رستہ ہے

محبت، وسطِ صحرا سے گزرتا راستہ ہے
زندگی، اس راستے کی منزلوں کا نام ہے، جاناں!
شناسا دھڑکنوں کی گونج میں
نا آشنا آنکھیں چمک اُٹھنا، سفر آمادگی ہے
اِس رہِ دُشوار پر پہلا قدم، پہلا پڑاؤ ہے
زمانہ! ایک صحرائی تمدّن ہے!
تمدّن! وسطِ صحرا سے گزرتے راستے پر
سوچ میں ڈوبی ہُوئی
بُوڑھی کھجوروں کا تصوّر ہے
یہ بُوڑھی، سَر خمیدہ مائیں! کن بیٹوں کو روتی ہیں؟
یہ صحرا! کس قدر سفّاک قانونوں کا جنگل ہے
یہ صحرا! اَن گِنت خُود رَو گل اَندا موں کا مدفن ہے
شناسائی کی اِس منزل پہ بھی ہم، اہلِ غم
اِک دُوسرے کے ساتھ
اِتنی عاجزی سے بات کرتے ہیں
کہ ہم تم اجنبی ہوں، اجنبی بستی سے آئے ہوں
کسی نا آشنا بستی کے راہی ہوں
یہ بوڑھی، سَر خمیدہ مائیں! کن بیٹوں کو روتی ہیں؟
کہ یہ بوڑھی کھجوریں!
اپنی چنچل بیٹیوں کے بَین سنتی ہیں؟
جو اُن کے اپنے سائے میں کہیں زندہ گڑی،
اُن کو پکارے جا رہی ہیں!
یہ کھجوریں کیا؟ اُنھی چیخوں کو سننے کے لیے
کچھ اور جھکتی جا رہی ہیں؟

خاک کی تہ میں، کوئی چنچل محبت ہے کہ پانی سر پٹکتا ہے؟
ہماری عاجزی، اِس رت جگے میں
اِس الاؤ سے لپک کر
ٹوٹتی چنگاریوں کا جمگھٹا ہے!
یہ لپکتی ٹوٹتی چنگاریاں بھی
چاند، تاروں اور سیاروں کے جُھرمٹ ہیں!
ہم اِن کی زندگی بھی دیکھ سکتے ہیں!
ہم اِن کی بے کسی پر سوچ سکتے ہیں!
شناسائی کی اِس منزل،
محبت کی رہ دُشوار کے اِس مرحلے پر، ہم بھی مِل کر سوچ سکتے ہیں
تمھیں معلوم ہے؟
یہ سوچ میں ڈوبی ہوئی بوڑھی کھجوریں
ہم کو کس حسرت سے تکتی ہیں؟
اگر ہم لوگ بھی اِک دوسرے کو
سوچ میں ڈوبی کھجوروں کی نظر سے دیکھ کر سوچیں
تو ہم بھی جان جائیں گے
کہ ہم اِک دوسرے کے ساتھ کیوں؟ اِس عاجزی سے بات کرتے ہیں!
فقط مقتول ہی اِس خامشی سے بات کرتے ہیں!
ہماری بدنصیبی کے سوا، اے جاں!
ہمارے ربط کی زنبیل میں کیا ہے؟
گزرتے قافلوں کی گھنٹیوں کی گونج کے پیچھے
فقط دہشت ہے! وحشت ہے!
محبت کی! محبت کے عدُو کی!
اُنس کی شہ رگ پہ چلتی تیغِ قاتل کی!
گزرتے قافلوں کی گرد کے پیچھے
ہمارے قاتلوں کا قافلہ ہے

جانِ جاں! یہ آخری شب ہے!
ہماری عاجزی کا آخری دن ہے!
ہماری بے کسی کا آخری پل ہے!
ہمارا غم، محبت تھا! ہمارا غم، محبت ہے!
محبت! زندگی کرنے کا اِک اُسلوب ہے! اے جاں!
یہ رستہ طے نہیں ہوتا
کہ یہ رستہ دِلوں کے وسط سے ہو کر نکلتا ہے
ہماری شہ رگوں کے ساتھ چلتا ہے
یہ رستہ زندگی بھر طے نہیں ہوتا!
سو، یہ بے کار رستہ، اہلِ دُنیا کاٹ دیتے ہیں!

کہانی منطقی رُخ پر نکل آئے، تو پوری ہو کے رہتی ہے!
ہماری خاک، دِل ہے!
آسماں، غم ہے!
تمنّا، چاند ہے!
ہر دکھ، ستارہ ہے!
یہ دُنیا ہے!
اِسے دُنیا کے ہاتھوں خاک ہونا ہے!
ہمارے ربط کو غم، خاک کو تریاک ہونا ہے!
کہ یہ انبوہِ انسانی!
فقط نم دیدگاں کی خاک کو سُرمہ بناتا ہے!
یہ دُنیا! ایک صحرا ہے!
محبت! وسطِ صحرا سے گزرتا راستہ ہے!
زندگی! اِس راستے کی منزلوں کا نام ہے!
یہ راستہ تہذیب ہے!
سلکِ تمدّن ہے!
اِسے تسبیح ہونا ہے!

کہ یہ انبوہِ انسانی،
اِسی تسبیح کے صد رنگ دانوں کا گھرانہ ہے!
محبت! ایک رستہ ہے!
ابھی یہ راستہ ہموار ہونا ہے!
کہ یہ رستہ تمدّن کے دیارِ رنگ کی جانب نکلتا ہے!
ابھی اِس راستے کو عام ہونا ہے!
اِسے آتے زمانوں کے لیے باب رم و رفتار ہونا ہے!
سنو! اے جاں!
چھنکتے گھنگھروؤں کی تال پر،
پگ پگ تھرکتی ڈاچیوں کی
گنگناتی گھنٹیاں کیا کہہ رہی ہیں؟
جانِ جاں! کیا ہم نہ کہتے تھے؟
یہ رستہ عام ہونا ہے!
سنو! اے جاں!
وفا کے قافلوں کی گھنٹیاں کیا کہہ رہی ہیں؟
آگہی کا سبز رقبہ دو قدم پر ہے!
سنو! اے جاں!
''محبت! ایک رستہ ہے!''
''یہ رستہ عام ہونا ہے!''
''محبت! آگہی کا سبز رقبہ ہے!
ہمیں اِس سبز رقبے تک پہنچنا ہے!
یہ رقبہ! ایک رُتبہ ہے!''
''محبت! ایک رُتبہ ہے!''
''محبت! ایک رُتبہ ہے!
ہمیں اِس مرتبے پر خاک ہونا ہے!''

خالد احمد

پہلو میں

جھنگروں کی پھر کی آوازوں نے رات کے کالے گھمیرتا کا احساس دوچند کر رکھا تھا۔ اک ہو کا عالم ہے اور میں کھلی آنکھوں سے اس برہنہ آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں جس کے بدن پر آج ایک بھی ستارے کا چیتھڑا نہیں ہے۔ میرا دل پوری شدت کے ساتھ دھڑک رہا ہے اور حواس پر دہشت کا گدھ اوندھا پڑا ہے۔ خوابوں کی پریاں مرجائیں تو تعبیر کے دیو گھیرا کرنے لگتے ہیں۔ عین اسی لمحے آسمان ایک چیخ کے ساتھ لرز اٹھتا ہے، اور پہلو میں لیٹا میرا بھائی ایک خوفناک کراہ کے ساتھ مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔ معاً اس کے لمس نے مجھے محسوس کرایا کہ وہ 10 سال کی عمر کا میرا ننھا بھائی نہیں ہے، وہ تو کوئی جوان آدمی ہے جس کے سیاہ بال اور سیاہ مونچھیں میرے ہونٹوں کو چھو رہے ہیں۔ ارے یہ تو میرا بہت پرانا خواب ہے۔ اس وقت کا جب مجھے نئی نئی پلکیں جھکانا آئی تھیں اور سینے پر دوپٹہ پھیلانا ابھی نہیں آیا تھا لیکن یہ لمس اب تک کیوں محسوس ہوتا ہے مجھے اب تو اس خواب کے راستے میں عمر کے بوڑھے پتھر حائل ہو چکے ہیں۔ ایک نامحرم جوانی کو اپنے اتنے قریب پا کر بدحواسی کا عقاب مجھ پر اپنے پنجے سخت کر دیتا ہے اور آسمان کے لال آنسو زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ آسمان کی ان خون آلود بوندوں سے میری چارپائی کے قریب ایک پودا سر اٹھاتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ہی ایک گھنے درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، درخت کے سائے میں میری چارپائی بھی ہے، میرا دس سالہ بھائی اب بھی مجھ سے لپٹا ہوا ہے۔

''آپا۔ کہانی سنائیں ناں''.. وہ نیند میں بدبداتا ہے۔

''یہ کہانیاں سننے کا نہیں، کہانی دیکھنے کا وقت ہے گڈو''۔

میں خوف سے اَٹے لہجے میں کہتی ہوں۔

آپا۔ کینسر کیا ہوتا ہے؟ وہ نیند میں بھی خوفناک سوال پوچھتا ہے، شاید اس کے خواب بھی ڈرے ہوئے ہیں۔

''گڈو تم کینسر کی باتیں کیوں کر رہے ہو، عشق پیچاں کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے ہو؟''

وہ کوئی جواب نہیں دیتا کروٹ بدل کر سو جاتا ہے۔

میرے سامنے درخت کی شکل اختیار کر جانے والے پودے کی شاخیں تیزی سے پھیلنے لگتی ہیں۔ اچانک ایک چمگادڑ میرے سر کے اوپر

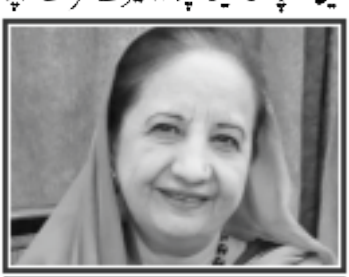

فرخندہ شمیم

اڑنے لگتی ہے، جسے دیکھ کر میرے حواس کے ساتھ چمٹا گدھ مزید پنجے گاڑھ کر مجھے خون خون کر دیتا ہے، میں بھیگی بند آنکھوں سے چرچ کے اندر میری کو آواز دیتی ہوں۔

لیکن ایک بار پھر مجھے واپس آنا پڑتا ہے اور میرے سامنے بیسویں اور اکیسویں صدی کی کامیاب عورتیں چاق و چوبند گھومتی نظر آتی ہیں ڈیانا سے لیڈی ڈیانا بننے والی ایک عام معلّمہ جسے منتخب کرنے والا ایک شہزادہ“ میں ایک آہ بھری ہوں میرے تصور میں میری ناکام محبت دوڑ جاتی ہے یا پھر وہ ایکٹریس جس نے جدید ترین ٹیکنالوجی سے بنی مصنوعات اپنے تابوت کی کشادہ زمین کو سجانے کی وصیت کی اور مر کر بھی آسودگی چکھتی رہی ..... کیا بلند بخت ۔۔۔ ہوکے ۔ میرے سینے سے امنڈتے چلے آتے ہیں اچانک ایک پتھر میرے سر پر گرتا ہے اور میرے بھیجے کو بلا مارتا ہے۔ سرخ آندھی بھڑکتی ہے اور دیو ہیکل درخت پر یکدم بڑھاپا آجاتا ہے۔ شاخیں کسی معمر شخص کی طرح جھلنگا ہوگئی ہیں۔ سب سے اونچی شاخ کے اندر سے ایک نورانی تسبیح جھانکتی ہے، ایک منقش جائے نماز فضا میں طلوع ہوتی ہے اور میں چمگاوڑ سے اوپر، بہت اوپر نماز کی نیت باندھ لیتی ہوں۔

اچانک ایک نئی آندھی میرے مصلے کو بے سمت کر دیتی ہے اور میرا قبلہ بدل جاتا ہے اور نیت کے الفاظ یوں ہو جاتے ہیں ”میں دعا کرتی ہوں کہ محلوں یعنی پیلس میں مجھے سجدہ تعظیم ادا کیا جائے اور ایوان میرے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں۔

اچانک کوئی میرے ساتھ بھیانک سازش کرتا ہے وہ مجھے سخت زمین پر پٹخ کر خود محل کی راہداریوں میں روپوش ہو جاتا ہے۔

ایک جھٹکے سے میں اپنی جھلنگا چارپائی پر آ گرتی ہوں اور ایک آتش فشاں اژدھا صحن کے فرش پر پھنکارتا ہے، اس کی زبان میں معمول سے زیادہ زہر ہے جسے زمین پر لہرانے سے ساری زمین زہریلی سبز ہو جاتی ہے اژدھا اس کامیابی پر بہت جھومتا ہے اور دیر تک ناچتا رہتا ہے۔

ایکا ایکی ایک زوردار دھماکہ ہوتا ہے اور دھوئیں کی بے پناہ لکیریں آسمان کی طرف بھاگنے لگتی ہیں، لگتا ہے کوئی جادوئی اثر تمام ہوا ہے، کچھ دیر! دیر بعد دھواں چھٹ جاتا ہے اور بوڑھا درخت نظر آتا ہے۔ جس کے پہلو سے ایک نیم پلیٹ چپکی ہے جس کے اوپر ایک عامل کا نام اور فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ درخت کی کھوہ میں ایک نسوانی ہیولہ مزاحمت کرتا نظر آتا ہے اور تسبیح کے دانے منتشر ہو جاتے ہیں۔

میرے لبوں سے سسکاری نکلتی ہے۔ اردگرد کی سبز زمین اب تڑخ گئی ہے، زہر نے اس کی ہڈیاں توڑ دی ہیں۔ اژدھا اب قبضوں کی لمبی کاغذی فہرست میں تبدیل ہو چکا ہے۔ فائلوں کے اردگرد سرخ فیتے بندھے ہوئے ہیں۔ آسمان پر چمگاوڑ کی شکل کے راکٹ اڑتے نظر آتے ہیں۔

میں گھبرا کر اپنے اردگرد دیکھتی ہوں، میرے پہلو میں سناٹا پنپ رہا ہے اور میرا بھائی دور دور تک نظر نہیں آ رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

بہت دیر کے بعد

دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کی ایک ہلکی لہر اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اندر روشنی مدھم تھی، مگر اس میں ایک فسوں تھا۔ ہر میز پر ایک چھوٹا سا لیمپ، کرسیاں ایک خاص زاویے پر رکھی ہوئی، اور ویٹرز کی چال میں وہ مخصوص ٹھہراؤ جو مہنگے ریسٹورنٹس کی پہچان ہوتا ہے۔

شہاب نے ایک لمحہ رک کر اندر کا جائزہ لیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ ہر نئی جگہ میں داخل ہوتے ہوئے پہلے فضا کو دیکھنا، جیسے وہ خود کو اس میں فٹ کرنے کا کوئی حساب لگا رہا ہو۔ پھر وہ سیدھا ایک کونے کی میز کی طرف بڑھ گیا، جہاں سے شیشے کے پار سڑک کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بیٹھ گیا۔ کوٹ کے بٹن کھولے، کلائی کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ آٹھ بج کر دس منٹ۔ وقت اس کے لیے ہمیشہ ایک سیدھی لکیر رہا تھا: صبح دفتر، فائلیں، میٹنگز، مختصر جملے، اور پھر شام۔ ایک طویل دلدوز خاموشی۔

مینو اس کے سامنے رکھا گیا، مگر اس نے اسے فوراً نہیں کھولا۔ اس کی نظر بے اختیار ادھر ادھر پھر رہی تھی، جیسے وہ کسی خاص چیز کو تلاش نہیں کر رہا، بس دیکھنے کی عادت پوری کر رہا ہو۔

''سر، آرڈر پلیز؟''

آواز قریب سے آئی تھی۔ وہ چونکا نہیں، مگر اس نے سر اٹھانے میں ایک لمحہ لیا۔ جیسے اس نے خود کو تیار کیا ہو۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لباس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو الگ سے نمایاں ہو، مگر دیکھتے ہی نظر رک جاتی تھی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا ایک سادہ مگر نفیس ٹاپ پہنا تھا، جس کی بناوٹ میں ہلکی سی نزاکت تھی نہ زیادہ تنگ، نہ ڈھیلا اور اس کے ساتھ ہلکے رنگ کی سیدھی پینٹ، جو اس کے قد اور قامت کے ساتھ ایک خاموش تناسب قائم کرتی تھی۔ اس کے چلنے میں کوئی بناوٹ نہ تھی، مگر قدموں کی روانی

وسیم جبران

میں ایک ٹھہرا ہوا اعتماد تھا، جیسے وہ ہر میز تک نہیں بل کہ کسی مخصوص سمت کی طرف بڑھ رہی ہو۔ بال پیچھے بندھے ہوئے تھے، مگر چند نرم لٹیں کانوں کے قریب آ کر رک گئی تھیں۔ بے دھیانی میں، مگر مکمل ترتیب کے ساتھ۔ اس کی رنگت غیر معمولی حد تک صاف اور گوری تھی، مگر اس میں چمک نہیں، ایک ہلکی سی دھیمی روشنی تھی۔ جیسے صبح کی پہلی روشنی دیوار پر ٹھہر جائے اور شور نہ کرے۔ چہرے پر میک اپ نہ ہونے کے برابر تھا، مگر آنکھیں ایسی صاف اور گہری تھیں کہ ایک لمحے کو دیکھنے والا ٹھہر جائے۔ شہاب کو بے اختیار یہ خیال آیا کہ یہ لڑکی اس جگہ کی نہیں لگتی، جیسے اسے کسی اور منظر میں ہونا چاہیے تھا، نہ کہ میزوں کے درمیان یوں بے آواز چلتے ہوئے۔ قریب آنے پر اسے ایک ہلکی سی خوشبو محسوس ہوئی تیز نہیں، بس اتنی کہ موجودگی کا احساس دلا دے۔ شہاب کی نظر اس کے چہرے پر تھی۔

''سر؟'' اس نے دوبارہ کہا۔

شہاب نے مینو کھولا، مگر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

''کیا ریکمینڈ کریں گی؟'' اس نے بے دلی سے پوچھا، جیسے یہ سوال اس نے پہلے بھی کئی جگہوں پر دہرایا ہو۔

وہ ذرا سا جھکی، مینو کی طرف اشارہ کیا، ''یوں تو سب کچھ لاجواب ہے لیکن آج کی شام کے لیے گرلڈ چکن اچھا ہے۔ اور پاستا بھی۔''

''آپ کیا پسند کرتی ہیں؟'' یہ سوال غیر ارادی طور پر نکلا، مگر اس کے لہجے میں ایک ہلکی سی دلچسپی آ گئی تھی۔

وہ سیدھی ہوئی، ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا، پھر مختصر سا جواب دیا، ''ہم یہاں صرف سرو کرتے ہیں، سر۔''

شہاب کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

''ٹھیک ہے پھر وہی لے آئیں جو آپ نے کہا ہے۔'' اس نے سر ہلایا، آرڈر نوٹ کیا، اور پلٹ گئی۔

شہاب نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھا، کچھ دور تک اس کی نظروں نے تعاقب کیا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور گہری سانس لی۔

دفتر میں اس کے جملے مختصر ہوتے ''جی، یہ فائل کل تک ہو جائے گی''

''نہیں، اس میں ترمیم کرنی ہوگی''

''میٹنگ چار بجے ہے۔'' اور پھر شام۔ شام کے بعد اس کے پاس کوئی نہیں ہوتا تھا۔ نہ کوئی فون، نہ کوئی انتظار۔ اسی لیے وہ اکثر باہر کھانا کھاتا تھا نہ ذائقے کے لیے، نہ ماحول کے لیے بس اس لیے کہ کچھ دیر

لوگوں کے درمیان بیٹھا رہے، چاہے کوئی اس سے بات نہ کرے۔

کھانا آ گیا۔ وہی لڑکی لے کر آئی۔ اس نے پلیٹیں میز پر رکھیں، چمچ کانٹا ترتیب سے رکھا، اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''کچھ اور چاہیے ہو تو بتائیے گا، سر۔''

شہاب نے اس کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے، اس کے ذہن میں ایک ہلکی سی چنگاری سی اٹھی، کوئی گہرا جذبہ نہیں، بس ایک خیال۔

''آپ کا نام؟'' اس نے اچانک پوچھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی، جیسے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

''کیوں، سر؟''

''بس جاننا چاہ رہا تھا کہ جس نے کھانا منتخب کیا ہے، اس کا نام بھی معلوم ہو جائے۔''

وہ ہلکا سا مسکرائی اس بار مسکراہٹ ذرا واضح تھی، مگر پھر بھی پوری نہیں۔

''نام سے کیا فرق پڑتا ہے، سر؟''

''کبھی کبھی پڑتا ہے۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''سارہ۔''

''اچھا نام ہے۔''

''تھینک یو، سر۔'' وہ پلٹ گئی۔ شہاب نے پہلا لقمہ لیا۔ اس بار ذائقہ محسوس ہوا، مگر اس سے زیادہ اسے اپنے ہی جملے کا اثر محسوس ہوا۔ وہ ہلکا سا ہنسا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے نیا نہیں تھا لوگوں سے ہلکی پھلکی باتیں کرنا، تھوڑا سا متاثر کرنا، پھر آگے بڑھ جانا۔ مگر یہاں کی بات اور تھی۔ اس نے چمچ میز پر رکھا اور کھڑکی کے پار دیکھا۔ باہر روشنی تھی، مگر سڑک خالی تھی۔

''برا نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے خود سے کہا۔ یہ کوئی جذبہ نہیں تھا۔ شاید اس کی لمبی شاموں کے لیے ایک سہارا تھا۔ اس کے بعد یہ ایک ترتیب بن گئی۔

شام کے قریب دفتر سے نکلتے ہوئے وہ گھڑی دیکھتا، فائلیں سمیٹتا، اور پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی تک آتے آتے اس کے ذہن میں اگلی منزل طے ہو چکی ہوتی۔ راستہ وہی، سڑکیں وہی، اشارے وہی بس اب ان سب کے بیچ ایک پڑاؤ شامل ہو گیا تھا، ریسٹورنٹ۔

پہلے دن کے بعد اس نے وہاں جانے میں کوئی وقفہ نہیں آنے دیا۔ جیسے وہ کسی غیر محسوس عادت میں ڈھل گیا ہو۔ وہی کونے کی میز، وہی بیٹھنے کا انداز، کرسی ذرا پیچھے کھینچ کر، کوٹ کے بٹن کھول کر، اور ہاتھ میز پر ہلکے سے رکھ دینا۔

سارہ اسے دیکھ کر اس کے قریب آتی اور وہ اس سے کھانے کے لیے رائے طلب کرتا۔ وہ اس کے رائے کے مطابق آرڈر لکھواتا۔ وہ سر ہلا دیتی، کچھ لکھتی، اور چلی جاتی۔ شہاب کوئی نہ کوئی بات چھیڑ کر اسے روک

دیتا۔ مگر وہ اس کی باتوں کو جلدی نبٹا کر آرڈر لینے چلی جاتی۔

''آپ روز یہاں ہوتی ہیں؟''

''جی، شام کی شفٹ ہے میری۔''

''اور دن میں؟''

''آرام۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''صرف آرام؟'' وہ اس بار ذرا سا رکی، پھر بولی۔

''اور کیا ہونا چاہیے، سر؟''

شہاب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے ہر کسی کی زندگی میں۔''

''ضروری تو نہیں۔'' اس نے سیدھے لہجے میں کہا، اور بات ختم کر دی۔

شہاب نے محسوس کیا کہ وہ بات کو آگے نہیں بڑھاتی۔ جہاں ضرورت ہو، وہیں رک جاتی ہے۔ اس کے جملے چھوٹے تھے، مگر معنی خیز ہوتے تھے۔

''آپ کو پتہ ہے، میں یہاں کیوں آتا ہوں؟'' ایک رات اس نے پوچھا۔

''کھانے کے لیے۔'' سارہ نے فوراً کہا۔

''نہیں -- کھانے کے لیے تو کہیں بھی جا سکتا ہوں۔'' وہ خاموش رہی۔

''میں آپ کے لیے آتا ہوں۔'' یہ جملہ اس نے بالکل سادہ انداز میں کہا، نہ ڈرامائی، نہ زور دے کر۔ جیسے وہ کوئی عام بات بتا رہا ہو۔ سارہ نے اس کی طرف دیکھا، ایک لمحہ ٹھہری، پھر ہلکا سا مسکرائی۔

''سر، یہ لائن بہت پرانی ہے۔'' شہاب بھی مسکرا دیا۔

''پرانی چیزیں ہی تو اچھی ہوتی ہیں۔''

''ہر چیز نہیں۔'' اس نے جواب دیا، اور ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔

شہاب نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھا، پھر پانی کا گلاس اٹھایا اور آہستہ سے ایک گھونٹ لیا۔ یہی تو تھا، وہ ہر بات کو ہنسی میں اڑا دیتی تھی، مگر شہاب پھر بھی اس کھیل کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اب یہ اس کے لیے ایک باقاعدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ وہ دفتر میں بیٹھا کبھی کبھار بے دھیانی میں مسکرا دیتا، ساتھی پوچھتے۔ ''کوئی اچھی خبر ہے؟'' وہ سر ہلا دیتا۔ ''نہیں، کچھ خاص نہیں۔'' اور واقعی، کچھ خاص نہیں تھا۔ یہ سب کچھ وہ جانتا تھا۔

''اگر میں ایک دن نہ آؤں تو؟'' اس نے ایک رات پوچھا۔ سارہ نے کندھے اچکائے۔ ''تو کوئی اور آ جائے گا۔''

''اور آپ کو فرق نہیں پڑے گا؟''

''ہمیں فرق نہیں پڑتا، سر۔ ہمیں صرف کام کرنا ہوتا ہے۔''

شہاب نے میز پر انگلیوں سے ہلکی سی تھاپ دی، جیسے کسی دھن کو پکڑنے کی کوشش

کررہا ہو۔

"مجھے پڑے گا۔" یہ جملہ اس نے آہستہ سے کہا، مگر سارہ نے سن لیا۔ وہ ایک لمحے کو رکی، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"آپ کو نہیں پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس شہر میں سینکڑوں ریسٹورنٹس ہیں، سر۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ شہاب کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، دھیمی آواز میں، جیسے خود سے اتفاق کررہا ہو۔

ہاں، ہیں مگر میں یہاں آتا ہوں اور یہیں آؤں گا۔

رات جب وہ واپس فلیٹ میں پہنچا تو کمرے کی خاموشی ویسی ہی تھی جس کا وہ عادی تھا۔ اس نے کوٹ کرسی پر ڈالا، جوتے اتارے، اور سیدھا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نیچے شہر پھیلا ہوا تھا، روشنیوں میں ڈوبا ہوا، مگر دور بہت دور شاید کوئی کھڑکی کھلی ہو، شاید کوئی جاگتا ہو۔

اس نے جیب سے موبائل نکالا، کچھ دیر ہاتھ میں گھماتا رہا، پھر بغیر کسی کو کال کیے واپس رکھ دیا۔ اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ یہ خیال ایک دم نہیں آیا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا، دفتر کی میز پر، گاڑی چلاتے ہوئے، اور رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے بھی۔

جیسے کوئی ہلکی سی آواز ہو جو پوری طرح سنائی نہ دے مگر خاموش بھی نہ ہو۔

"یہ میں کیا کررہا ہوں۔ بس کرو اب۔"

اس نے ایک دن خود سے کہا، جب وہ فائل بند کرکے کرسی سے پیچھے ہٹا۔

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ جواب واضح تھا، اور وہ اسے جانتا بھی تھا۔ "کچھ نہیں۔"

وہ کرسی سے اٹھا، کوٹ پہنا، اور آہستہ آہستہ پارکنگ کی طرف چل پڑا۔ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔

"کہاں تم اور کہاں وہ۔" یہ جملہ اس کے ذہن میں یوں آیا جیسے کسی اور نے کہا ہو۔ وہ ہلکا سا مسکرایا، مگر اس مسکراہٹ میں کچھ کھنچاؤ تھا۔ وہ ایک متمول آدمی تھا، اچھی جاب، اچھی تنخواہ، اسلام آباد کے پوش علاقے میں کروڑوں کا فلیٹ، ماسٹر ڈگری، سالوں کی محنت، اور ایک ایسا دائرہ جس میں ہر چیز کی قیمت اور جگہ طے تھی۔ اور دوسری طرف، ایک ویٹرس۔

اس نے دھیرے سے سر ہلایا، جیسے کسی فیصلے پر مہر لگا رہا ہو۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر وہ ہمیشہ کی طرح اسی میز پر جا بیٹھا، مگر آج اس کے بیٹھنے میں وہ بے فکری نہیں تھی۔ اس نے کرسی کھینچی، بیٹھا، مگر ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے ذرا سا ٹھہر گیا۔ سارہ آئی۔

''آج کیا لیں گے، سر؟''

شہاب نے اس کی طرف دیکھا، اور اس بار اس نے اسے غور سے دیکھا، جیسے وہ پہلی بار دیکھ رہا ہو، یا آخری بار۔

''پہلے ایک بات۔'' اس نے کہا۔ وہ رک گئی۔

''جی؟''

شہاب نے ایک لمحہ سانس لی، پھر سیدھے انداز میں بولا۔ ''جو کچھ میں پچھلے دنوں کہتا رہا ہوں، اس کا مجھے افسوس ہے۔''

سارہ کے چہرے پر کوئی فوری تبدیلی نہیں آئی۔ وہ ویسے ہی کھڑی رہی، جیسے وہ ہمیشہ کھڑی ہوتی تھی، سیدھی، متوازن۔ شہاب نے بات جاری رکھی۔

''میرا مطلب ہے میں صرف مذاق کر رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے۔ آپ کو شاید اندازہ ہو گیا ہوگا۔''

وہ خود اپنے الفاظ کو سن رہا تھا، جیسے یہ کسی اور کے الفاظ ہوں۔

''میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا، بہرحال آپ اسے سنجیدہ نہ لیں۔ میں اب آپ کو تنگ بھی نہیں کروں گا۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ ریسٹورانٹ کی ہلکی موسیقی پس منظر میں چل رہی تھی، پلیٹوں کی ہلکی سی آواز اور دور کسی میز پر دبی ہوئی ہنسی۔

سارہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔

''اوکے، سر۔''

بس اتنا ہی۔ مگر اس ''اوکے'' میں وہ ہلکی سی مٹھاس نہیں تھی جو وہ پہلے محسوس کرتا تھا۔ پھر اس نے نظر اٹھائی۔ ایک لمحہ بس ایک لمحہ اس کی آنکھیں ٹھہریں۔ وہی آنکھیں، جن میں ہمیشہ ہلکی سی چمک ہوتی تھی۔ مگر اس بار ان میں ایک ہلکی سی نمی تھی، ایسی کہ اگر کوئی غور نہ کرے تو نظر نہ آئے، اور اگر ایک بار دیکھ لے تو بھول نہ سکے۔ شہاب نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے، مگر الفاظ لبوں تک نہیں آئے۔ سارہ نے مینو کی طرف دیکھا۔

''آرڈر، سر؟''

لہجہ وہی تھا، مگر نہ جانے کیوں شہاب کو اجنبیت سی محسوس ہوئی۔

''جو پہلے لیتا تھا، وہی لے آئیں۔'' شہاب نے آہستہ سے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور چلی گئی۔ شہاب کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں، پھر کھول دیں۔ کمرے کی روشنی ویسی ہی تھی، مگر اسے کچھ مختلف محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کمی سی ہو۔ کھانا آیا، اس نے چند لقمے لیے، مگر ذائقہ محسوس نہیں ہوا۔ اس نے ادائیگی کی، اور بغیر ادھر ادھر دیکھے اٹھ گیا۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا تو رات پہلے سے زیادہ خاموش لگی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے کچھ دیر اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے

ہی گزار دیے۔

''ٹھیک کیا'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہ فیصلہ درست تھا۔ یہ ضروری تھا۔ یہی ہونا چاہیے تھا۔''

وہ گھر پہنچا، فلیٹ کا دروازہ کھولا، اندر آیا۔ کمرہ ویسا ہی تھا، صاف ستھرا اور خاموشی میں لپٹا ہوا۔ وہ سیدھا کھڑکی کے پاس گیا۔ نیچے شہر پھیلا ہوا تھا، روشنیوں میں ڈوبا ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ اور اسی لمحے اچانک وہی منظر ابھرا۔ ایک لمحہ ٹھہری ہوئی آنکھیں ۔ اور ان میں ایک باریک سی نمی۔ شہاب نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

''بس۔۔'' اس نے خود سے کہا۔

مگر اس ایک لمحے نے جیسے کہیں اندر جگہ بنالی تھی، ایسی جگہ، جہاں سے چیزیں آسانی سے نہیں جاتیں۔ وہ کھڑا رہا، دیر تک۔ شہر نیچے ویسا ہی تھا۔ مگر اسے کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ رات نے اس دن کچھ زیادہ دیر لگائی۔ گزر ہی نہیں رہی تھی۔ شہاب نے بستر پر لیٹنے کی کوشش کی، مگر نیند جیسے اس سے خفا ہوگئی ہو۔ وہ ایک کروٹ لیتا، پھر دوسری، پھر اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ کمرے میں وہی ترتیب تھی، ہر چیز اپنی جگہ پر مگر اس کے اندر کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ اور فوراً وہی منظر۔۔ وہ آنکھیں۔۔۔ اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

''کچھ نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ اٹھا، پانی پیا، کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

''یہ سب وہم ہے۔''

اس نے خود کو سمجھایا۔

''کہاں تم — اور کہاں وہ۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا، ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر جھک گیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اگلی صبح وہ دفتر گیا۔ فائلیں اس کے سامنے تھیں، مگر نگاہیں ایک جگہ ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ ایک جملہ پڑھتا، پھر وہی آنکھیں درمیان میں آ جاتیں۔ کسی نے کچھ پوچھا، اس نے جواب دیا، مگر خود بھی نہیں سنا۔ چند دن اسی طرح گزرے۔ اس دن وہ دفتر میں تھا۔ دوپہر تک اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ شام آئی، اور اس کے ساتھ وہی سوال۔

''جاؤں یا نہ جاؤں؟''

وہ کرسی پر بیٹھا رہا، کافی دیر تک۔ پھر اچانک اٹھا، کوٹ پہنا، اور باہر نکل آیا، جیسے فیصلہ اس نے نہیں، کسی اور نے کیا ہو۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔ ''بس دیکھنے جا رہا ہوں۔۔ کچھ نہیں ہے۔''

مگر دل کی دھڑکن معمول سے تیز تھی۔ ریسٹورانٹ کے دروازے تک پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا۔ ہاتھ دروازے پر تھا، مگر اس نے فوراً نہیں کھولا۔

''کچھ نہیں ہے۔''

اس نے آخری بار خود سے کہا، اور دروازہ دھکیل دیا۔ اندر وہی روشنی تھی، وہی میزیں، وہی ترتیب۔ وہ سیدھا اپنی میز کی طرف گیا، بیٹھ گیا۔ اس کی نظر بے اختیار دروازے، کاؤنٹر، اور ہال کے مختلف کونوں میں گھوم رہی تھی۔ کوئی اور ویٹرس آئی۔

''سر، آرڈر پلیز؟''

شہاب نے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے پوچھا۔ ''وہ-- سارہ کہاں ہے؟''

ویٹرس نے ایک لمحہ سوچا، پھر کہا۔ ''سر، وہ اب یہاں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے جاب چھوڑ دی ہے۔'' شہاب نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کب؟''

''چند دن پہلے۔''

''کہاں گئی ہے؟''

ویٹرس نے کندھے اچکائے۔ ''ہمیں نہیں معلوم، سر۔''

شہاب کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے کہا۔ ''منیجر سے بات ہو سکتی ہے؟'' چند لمحوں بعد منیجر اس کے سامنے تھا۔

''جی سر؟''

''وہ-- سارہ۔''

منیجر نے بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سر ہلایا۔ ''جی، وہ جا چکی ہے۔''

''کہاں؟''

''یہ اس نے نہیں بتایا۔ بس اتنا کہا تھا کہ اب وہ یہ جاب نہیں کرے گی۔''

''کسی کو نہیں معلوم؟''

''نہیں، سر۔''

شہاب نے کچھ کہنا چاہا، مگر الفاظ نہیں ملے۔ منیجر نے رسمی لہجے میں پوچھا۔

''آپ آرڈر دیں گے، سر؟''

شہاب نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ''نہیں۔''

وہ کرسی سے اٹھا، اس نے مختلف لوگوں کو خوش گپیاں کرتے اور کھانا کھاتے ہوئے ایک نظر دیکھا اور قدم بڑھا دیے۔ دروازے تک جاتے ہوئے اس کے قدم پہلے جیسے ہموار نہیں تھے۔ باہر نکل کر وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

رات وہی تھی۔ شہر وہی تھا۔ مگر اب اس میں کچھ کم ہو گیا تھا، یا شاید کچھ چھن گیا تھا۔ وہ گاڑی تک گیا، دروازہ کھولا، مگر بیٹھنے سے پہلے رک گیا۔

''اس نے جاب کیوں چھوڑ دی؟''

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا، مگر وہ کچھ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے سڑک تھی، سیدھی، روشن، اور خالی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے اسے سب کچھ صاف صاف سمجھ میں آ گیا مگر بہت دیر کے بعد۔

☆☆☆☆☆

چڑیا گھر

شہر پر شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ لوگ خوف کے مارے زندگی کا تحفظ ڈھونڈ رہے تھے۔ خازان، چڑیا گھر میں کام کرتا تھا۔ جانوروں کی خوراک کی دیکھ بھال اُس کے ذمہ تھی جو دُنیا کے مختلف ممالک سے یہاں لائے گئے تھے، یہی وجہ تھی کہ اُن کا سب سے بڑھ کر خیال رکھا جاتا۔ تاکہ اُن کی خوراک اور نشوونُما میں کوئی کمی نہ آئے۔ خازان ہی وہ شخص تھا جوان تمام نرم خُو اور غصیلے جانوروں کے پنجرے کھولتا اور اُن کو خوراک کھلانے کی ذمہ داری انجام دیتا۔ وہ بہت چاق و چوبند تھا اور پرندوں اور جانوروں کو کھانا دینے میں کبھی بھی کوئی غفلت نہ برتتا۔ اُس کی ساری زندگی اس چڑیا گھر میں گزری تھی، اس لیے وہ ان تمام مخلوقات سے اُنس رکھتا تھا اور وہ بھی اس کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لیے جب بھی وہ اُن کے پنجروں میں داخل ہوتا تو وہ کبھی بھی ناگواری کا اظہار نہ کرتے۔ اگر کسی دن خازان چھٹی پر ہوتا تو انتظامیہ کے لیے جانوروں کو کھانا کھلانا ایک مشکل ترین عمل بن جاتا کیونکہ وہ کسی کو بھی اپنے پنجرے میں نہ آنے دیتے۔ اس لیے خازان بہت ہی کم چھٹی پر جاتا۔ اُسے یاد تھا کہ اُس نے اپنی پُوری نوکری میں صرف دو بار ہی چھٹی کی تھی؛ ایک بار جب اُس کے والد کی وفات ہوئی تھی اور دوسری بار جب اُس کی بیوی ہسپتال میں داخل ہوئی اور اُس کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ صرف یہی دن، وہ چڑیا گھر سے دور رہا تھا۔

وہ اپنے فرض میں منضبط تھا؛ صبح سویرے،

حمزہ حسن شیخ

سب سے پہلے وہ چڑیا گھر میں داخل ہوتا تاکہ پرندوں اور جانوروں کو بروقت کھانا پہنچا سکے۔ وہ اپنا سارا دن وہیں بیتاتا۔ اگر کبھی کبھار اُسے کوئی کام درپیش ہوتا تو وہ جلد از جلد اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچاتا اور رات کے اندھیرے سے پہلے پہلے واپس چڑیا گھر پہنچ جاتا تاکہ وہاں کے باسیوں کو خوراک مہیا کر سکے۔ وہ سب کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد، چڑیا گھر سے نکلنے والا آخری شخص ہی ہوتا۔ اُس کا چھوٹا سا کوارٹر چڑیا گھر کے قریب ہی تھا جہاں وہ اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کی تنخواہ کم تھی لیکن اُس کی زندگی خوشحال اور غموں سے آزاد تھی اور وہ اپنی زندگی سے بھرپور مزے لے رہا تھا۔ اُس کا تین سالہ اکلوتا بیٹا اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو خوب پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا انسان بنانا چاہتا تھا۔ وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا بھی اُس جیسی جفاکش اور مشکل زندگی گزارے۔ اُس نے اپنے بیٹے کے لیے کئی خواب دیکھے تھے کہ وہ اس دُنیا کا ایک کارآمد شہری بنے۔ خازان نے جس علاقے میں آنکھیں کھولیں تھیں، وہاں پر شاذونادر ہی امن ہوتا تھا۔ اُس کے بچپنے سے ہی اس علاقے میں شدید لڑائیاں ہوتی چلی آ رہی تھیں اور کبھی کبھار ہی جنگ بندی ہوتی تھی۔ ظالم آبادکار ہمیشہ ہی اُن کی املاک چھیننے کے لیے اُن کے علاقوں پر حملہ آور ہو جاتے اور جب مقامی لوگ اپنی املاک بچانے کی کوشش کرتے تو جواباً یا اُن کو پیٹا جاتا یا پھر مار دیا جاتا۔ خازان کے پاس کئی تلخ یادیں تھیں کیونکہ کئی لوگوں کو، کبھی ایک بہانے تو کبھی دوسرے، اُس کی آنکھوں کے سامنے پیٹا یا مارا جا چکا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر واقعات ایسے تھے جن میں وہ ظالموں سے اپنی املاک یا اثاثے بچانے کے لیے اُن سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ بہت بار، ان قابض مافیہ آبادکاروں اور مقامی لوگوں کے درمیان جھڑپیں ہوئی تھیں۔ قابض افواج کے فوجی اُن پر گولیاں برساتے لیکن اُن کے پاس ایسا کچھ بھی نہ تھا سوائے پتھر اُچھالنے کے۔ اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں، وہ بھی ایسی لڑائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا کیونکہ یہ جدوجہد اُس کی زندگی کا حصہ تھی اور یہ اُن کے علاقے میں روزمرہ کی زندگی تھی جس کے لیے کوئی مخصوص وقت نہ تھا۔ کبھی کبھار وہ قابض افواج کے کچھ ظالم فوجیوں کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور اکثر ہی اُن کے لوگ زیادہ زخمی ہوتے۔ اس طرح

یہ جنگ کئی سالوں سے جاری تھی۔ شادی کے بعد، وہ ایسی تمام جنگوں سے دور ہو گیا کیونکہ اُس کی بیوی اُس کو کسی ایسی جھڑپ کا حصہ نہیں بننے دیتی تھی۔ وہ کبھی بھی اُسے نہیں کھونا چاہتی تھی اور دوسرا وہ چڑیا گھر کے ڈھیر سارے جانوروں اور پرندوں کی دیکھ بھال میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اب اُسے اپنے بارے میں بھی سوچنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ مصروف زندگی کی وجہ سے، اُسے سالوں سے جاری ان جھڑپوں میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی؛ یہاں تک کہ اُن کا ملک بھی ایسے دنگے فسادوں کی وجہ سے خاصا بوڑھا ہو گیا تھا۔

وہ روزانہ پرندوں اور جانوروں کو کھانا کھلاتا اور اُس کو ان سے اُنس تھا، اگرچہ اُس کو اُن کی قربت حاصل کرنے میں خاصا وقت لگا تھا۔ شروع کے دنوں میں، جانور اُس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے لیکن بعد میں وہ آہستہ آہستہ اُس سے مانوس ہو گئے۔ اُس کو بچپن سے ہی جانور اور پرندے بہت بھاتے تھے، اس لیے اُس نے اس نوکری کا انتخاب کیا تھا۔ خوش قسمتی سے، چڑیا گھر اُس کے گاؤں کے قریب تھا اس لیے وہ یہ نوکری حاصل کرنے کے بعد بہت خوش تھا کہ اس طرح وہ اپنی زندگی سکون سے گزار سکے گا۔ بعد میں، اُس کی دشمن پر پتھر پھینکنے سے بھی جان چھوٹ گئی کیونکہ اُس کے پاس ان جھڑپوں میں حصہ لینے کا وقت نہیں تھا۔ کبھی کبھار، ان قابض آبادکار افواج کے خلاف بے حاصل لڑائی لڑنے والے سارے آزادی کے متوالے اُس کو اپنا اور لوگوں کا وقت برباد کرنے کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہ دیتے لیکن ایسے خیالات کے اظہار کے لیے اُس کے پاس جرأت نہ تھی۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد، وہ اُس کی جانب زیادہ مائل ہو گیا۔ اُس کو بیٹا اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا اور یہ محبت ناقابل بیان تھی۔ وہ خود ہی اُس کو اسکول چھوڑنے کے لیے جاتا اور پھر واپس گھر لے کر آتا۔ اگر اُس کے بیٹے کی اسکول سے چھٹی ہوتی تو کم از کم ایک بار وہ گھر کا چکر ضرور لگاتا تاکہ اپنے بیٹے کو دیکھ سکے۔ اُس کی بیوی اُسے اکثر کہتی کہ وہ بیٹے کو اپنے حواس پر اس طرح طاری کر کے خود کو پاگل کر دے گا لیکن یہ اُس کی شفقت پدری تھی جو کبھی بھی کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ یہ جنگی جھڑپیں اُن کی زندگی کا معمول تھیں اس لیے وہ اپنے بیٹے کو گھر ہی میں رکھتا کہ کہیں وہ پتھر مارنے یا غلیل بازی جیسی

عادات میں نہ پڑ جائے۔

انھی دنوں، غزہ پر حملوں میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ دونوں اطراف کے لوگ، ایک دوسرے پر پتھر اُچھال کر یا گولیاں برسا کے اپنا اپنا غصہ ٹھنڈا کر رہے تھے۔ گلیاں زیادہ تر ویران ہی رہتیں جب تک کہ قابض افواج کی کوئی گاڑی گشت کے لیے نہ گزارتی۔ گاڑی کے آتے ہی لوگوں کا ہجوم وہاں اکٹھا ہو جاتا اور گاڑی پر پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی۔ اکثر اوقات یہ جھڑپیں چلتی رہتیں۔ خازان زیادہ تر اپنے گھر میں بند رہتا۔ وہ گھر سے صرف اُس وقت ہی باہر نکلتا جب دفتر کی گاڑی اُس کو لینے کے لیے آتی۔ زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں تھی سوائے ظلم کی زیادتی اور پھر اس کو سہنے کے تناسب میں۔ خازان نے اپنی آنکھوں کے سامنے کئی لوگوں کو مرتے دیکھا تھا اور اُس کے اردگرد ایسے کئی بچوں کا ہجوم تھا جو ان جنگی جھڑپوں میں اپنے ہاتھ، پیر، ٹانگیں اور بازو کھو چکے تھے۔ اب وہ صرف لُولے لنگڑے، کانے یا کچھ تو اندھے بھی تھے۔ اُس کے سر پر ایک خوف ہر وقت منڈلاتا رہتا، اس لیے وہ اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ زیادہ ہی محتاط تھا کیونکہ وہ کبھی بھی اُس کو اس قسم کے کسی غم والم میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ زیادہ ہی والہانہ پیار کرنے لگا تھا۔ زندگی اسی افراتفری کا شکار تھی کہ اسرائیل اور فلسطین کی باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ سینکڑوں لوگ مرنے لگے اور اردگرد کی ساری زندگیاں داؤ پر لگ گئیں۔ جیسے جیسے فضائی حملوں میں شدت آتی گئی، ہر ایک کے سر پر خطرہ منڈلانے لگا۔ زندگی مکمل طور پر درہم برہم ہو گئی، ساری گلیاں اُجڑ گئیں اور پورے شہر میں ہو کا عالم تھا۔ شہر کا سکوت صرف و صرف، ایمبولینسوں کے گونجتے ہوئے سائرنوں، ہوائی جہازوں کی گھن گرج یا زخمیوں کی آہ و بکا سے ٹوٹتا۔ گھر تباہ ہونے لگے اور لوگوں نے نقل مکانی شروع کر دی۔ خازان اور اُس کے خاندان نے بھی کوئی اور صورت حال نہ ہوتے ہوئے واپس گاؤں ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خازان پریشانی اور کشمکش کا شکار تھا۔ چڑیا گھر کی انتظامیہ اُس کو نوکری سے چھٹی دینے کے لیے کسی بھی صورت تیار نہیں تھی کیونکہ چڑیا گھر میں جانوروں اور پرندوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی اور موزوں شخص نہ تھا۔ یہ صورت حال اُس کے لیے بہت گھمبیر تھی۔ فضائی حملے بڑھنے لگے اور انسان بغیر کسی حساب کتاب کے مرنے لگے۔ اُس نے اپنی پُوری زندگی میں ایسی بھیانک صورت حال کا سامنا کبھی نہیں کیا تھا۔ اُس کی بیوی بار بار ہجرت کے

لیے اصرار کر رہی تھی۔ یہاں پر کوئی تحفظ نہ تھا اور وہ کسی بھی وقت، ان بے رحم فضائی حملوں میں برستی ہوئی آگ کا نوالہ بن سکتے تھے۔ اُس نے اپنے حکام سے دوبارہ بات کی لیکن انھوں نے اُسے مزید ایک دن رُکنے کے لیے کہا تاکہ وہ کوئی حتمی فیصلہ کر سکیں۔ جب تک کہ چڑیا گھر کے جانور اور پرندے محفوظ نہیں تھے، وہ کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اُس کے حکام نے اُسے، اُس کے پُورے خاندان کے تحفظ اور محفوظ مقام پر منتقلی کا یقین دلایا تھا لیکن ان آخری لمحات میں، جب ہر سُو بم برس رہے تھے، وہ اُن کے کسی بھی وعدے پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ چڑیا گھر کے تمام پرندوں اور جانوروں کو تحفظ کے لیے آسٹریلیا منتقل کر دیا جائے گا جب تک کہ جنگ بندی نہیں ہو جاتی۔ یہ اُس کے لیے اچھی خبر تھی لیکن بیک وقت، اس خبر نے اُسے اُداس بھی کر دیا کیونکہ ایسا کوئی بھی اعلان انسانی جانوں کے لیے نہیں تھا۔ وہ خاصی دیر اُداس رہا لیکن اُس کے پاس قوانین اور فیصلے تبدیل کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ سوچتا رہا کہ، انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں، لیکن جنگ تو انسانوں کی تھی ناں، بھلا انسانوں کی جنگ میں بے زبان جانوروں کا کیا قصور؟ اور دوسرا ان میں سے بہت سے جانور اور پرندے نایاب نسل کے تھے جو معدوم ہوتے جا رہے تھے جن کا تحفظ اشد ضروری تھا، انسانی نسل بھلا معدوم تھوڑی ہو رہی تھی کہ اس کا تحفظ یقینی بنایا جاتا۔ انسان تو صدیوں سے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے آ رہے تھے لیکن پھر بھی ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔ سارا دن، وہ انہی خیالات کے ساتھ، پرندوں اور جانوروں کی منتقلی کے لیے، اُن کو مختلف پنجروں میں بند کرنے میں مصروف رہا اور پُورے اسٹاف کا مددگار رہا لیکن ابھی ایک روز کا کام باقی تھا اور کل صبح آخری فلائیٹ تھی۔ رات کو خاصی دیر سے، وہ سارے دن کا تھکا ہارا واپس گھر لوٹا اور تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی نیند نے اُس کو آ لیا۔

آدھی رات کو، اُس کی آنکھیں ایک خوفناک دھماکے سے کُھلیں۔ جب اُس کے حواس لُوٹے تو اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دلسوز منظر تھا۔ اُس کا گھر مکمل طور پر زمین بوس ہو چکا تھا اور فضا میں ایک طیارے کی گھن گرج گُونج رہی تھی۔ اُس کی مردہ بیوی صحن میں پڑی تھی جبکہ اُس کا بیٹا بدحواسی کے عالم میں، دھوئیں اور گرد و غبار کے پہاڑ میں، مردہ ماں کے ساتھ، اُس کے خُون میں نہایا بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُس

کے سامنے قیامت کا کوئی منظر ہے اور وہ اپنے حواس کھو چکا ہے۔ بمشکل، جب اُس نے اپنے حواس پر قابو پایا اور ساری صورت حال سمجھنے کے قابل ہوا تو وہ اپنے بیٹے کی جانب دوڑا۔ اُس نے لپک کر اُسے اپنی گود میں اُٹھایا اور اُس کے چہرے سے گرد صاف کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے، اُس نے سکھ کا سانس لیا کہ اُس کا بیٹا زندہ تھا۔ بچے کو سنبھالنے کے بعد، وہ اپنی بیوی کی جانب متوجہ ہوا جو صحن میں مردہ پڑی تھی۔ وہ چیخ اُٹھا کیونکہ آنسو بہانے کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ جب اُس کی نظر اپنے جسم پر پڑی تو وہ اپنے لہو میں سرتاپا نہایا ہوا تھا۔ اگرچہ اُس کے بازو اور ٹانگیں بالکل ٹھیک تھے لیکن وہ یوں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اندر اندر سے گھلتا جا رہا تھا لیکن زخموں کی مرہم پٹی کے لیے اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اپنے علاقے میں ایمبولنسوں کے سائرنز کی آواز سُن رہا تھا لیکن ان میں سے کسی میں جگہ پانے کے لیے اُس میں ہمت نہ تھی۔ اُس نے اپنے روتے بلکتے بیٹے کو لیا اور چڑیا گھر کی جانب قدم بڑھائے۔ اُسے یقین تھا کہ اس جیتی ہوئی رات کے ان اندھیرے لمحوں میں، پُورے شہر میں صرف وہی ایک جگہ تھی جہاں اُسے سکون کے چند لمحے میسر آ سکتے تھے۔ آخرکار، وہ چڑیا گھر پہنچ گیا جہاں پر چوکیدار جاگ رہے تھے اور انھوں نے اُس کی مرہم پٹی میں بہت مدد کی۔ فسٹ ایڈ حاصل کرنے کے بعد، اُس نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ اُس نے غم اور غنودگی میں ڈوبے اپنے بیٹے کو پیار سے دیکھا۔ اگرچہ اُس کی مرہم پٹی ہو چکی تھی لیکن اُس کے اندر بیٹے کو کھونے کا خوف انگڑائیاں لے رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ہر حالت میں محفوظ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چڑیا گھر میں اپنے کیبن میں گیا، بیٹے کو نہلایا اور اُسے صاف ستھرا کرنے کے بعد، گتے کے ایک بڑے کارٹن میں بند کیا۔ اُس نے اچھی طرح تسلی کی کہ اُس کا بیٹا بالکل محفوظ رہے گا۔ صبح سویرے ہی آخری فلائیٹ تھی جو چڑیا گھر کے باقی جانوروں اور پرندوں کو لے کر جا رہی تھی۔ اُس نے ایک بے ضرر جانور کے دیوقامت پنجرے میں، اپنے سوئے ہوئے بیٹے کے کارٹن کو چُھپایا اور سکھ کا سانس لیا۔ اُبھرتے ہوئے سُورج کی کرنوں کے ساتھ، اُس کے خون بہنے میں تیزی آ گئی۔ جب جہاز نے اُس کے بیٹے سمیت سارے پنجرے لدنے کے بعد، اُڑان بھری تو اُس کی بند ہوتی آنکھیں جہاز پر جمی تھیں اور اُس کے منہ سے خون ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہا تھا لیکن وہ مطمئن تھا کہ اُس نے اپنی نسل کو بھی معدومی سے بچا لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

فیصلہ

لفظ ''فیصلہ'' میں عجیب کیفیت پوشیدہ ہے اور یہ وہی محسوس کرسکتا ہے۔ جو فیصلہ سننے کا منتظر ہو۔ مقررہ وقت تک دل کی دھڑکن تیز اور بے کلی کا چھایا رہنا۔ فیصلہ حق میں ہو تو چہرے پر شادمانی اور سکون کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ فیصلہ مخالف ہو تو دل یوں بجھ جاتا ہے جیسے جلتے ہوئے انگاروں پر پانی ڈال دیا جائے۔

اب بھی میں حال کی کھڑکی سے ماضی کی طرف جھانکتی ہوں تو مجھے وہ لمحات تھوڑی دیر کے لئے ہلا کر رکھ دیتے ہیں جب میں بھی فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔ مجھے بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ اُسی فیصلہ کی رو سے آج میں زندہ ہوں۔

حسب معمول جاوید اپنی چھٹی گذارنے گھر آئے تو ہمیشہ کی طرح میں نے بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ جاوید مجھے بہت چاہتے تھے اور میں نے بھی کبھی کمی نہ آنے دی دوسرے ہی روز اچانک بلاوجہ مجھ سے غصہ کی حالت میں گویا ہوئے۔

''کان کھول کر سُن لو ناہید! اگر تم نے اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو میں کچھ اور سوچنے پر مجبور ہوں گا۔ نوبت طلاق تک بھی جاسکتی ہے یہ میرا پہلا اور آخری حکم ہے اچھی طرح سوچ لو۔''

جاوید کس قدر غصے میں سُرخ ہو رہے تھے آج پہلی بار ان کا یہ رُوپ بھی سامنے آیا۔ اتنی بڑی بات کس روانی کے ساتھ کہہ گئے ان کی دانست میں یہ بات نہایت معمولی تھی یا پھر انہوں نے مردوں کا ازلی حق سمجھتے ہوئے اور اپنی برتری کا احساس دلاتے ہوئے کہہ دی میں ان کا منہ دیکھتی رہ گئی اور وہ مجھے نظرانداز کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

حالات اس قدر شدت اختیار کر جائیں گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جاوید ابھی کل ہی تو آئے تھے پہلے دِن محبت

ناز اوکاڑوی

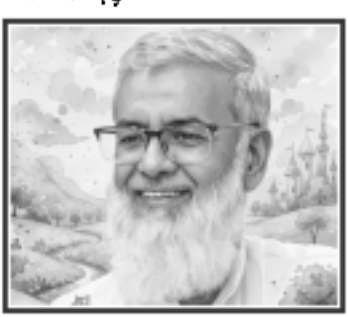

سے پیش آئے بعد میں نہ جانے کیا ہوا کہ اُکھڑے اُکھڑے سے رہنے لگے۔ تعلقات کی فضا مکدر ہو کر رہ گئی۔ میں نے جب بھی اس تبدیلی کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی تو نہایت ترش لہجہ میں ایک ہی جواب دیتے۔ ''بس تم اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرو اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' اگر زیادہ اصرار کرتی تو مجھے اکیلی کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل جاتے اور میں اپنی بے بسی پر آنسو بہا کے رہ جاتی۔ ان کی رخصت کے دوران میں نے ان کی اطاعت گذاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی پر وہ مطمئن نہ ہوئے۔

چھٹی کے اختتام پر رنجیدہ دِل لئے واپس اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ ان کے یوں جانے سے میں طرح طرح کی سوچوں میں غلطاں رہنے لگی۔ عجیب سے وسوسے اور خدشات اپنے اُوپر مسلط کر لئے۔ میں اس گتھی کو سُلجھانے سے قاصر تھی۔ اس اذیت سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں کچھ سمجھ نہ آتا۔ دِن بھر مصروفیات میں گذر جاتا لیکن رات سوچوں کے بھنور میں ڈُوب کر رہ جاتی۔ بستر کانٹوں کی سیج معلوم ہوتا۔ نیند بھی روٹھے ہوئے محبوب کے ساتھ ناراض ہو کر رو گئی۔

حصول روزگار کے لئے دیار غیر جانا کوئی معیوب بات نہیں۔ بہتر مستقبل کے لئے کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تو انسان کرتا ہی ہے' کہیں ایسا تو نہیں وہاں کسی اور کے ساتھ..... نہیں نہیں جاوید ایسا سوچ بھی نہیں سکتا وہ ایک محبت کرنے والی بیوی کا شوہر ہے۔ وہ ایسا کیوں کرنے لگے میں نے ان کی محبت میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ایسا سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔

کبھی دھیان سُسرال کی جانب چلا جاتا شاید در پردہ وہی جاوید کو بہکا رہے ہوں لیکن میں نے اپنے تئیں ان کی خدمات میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ ان کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتی ہوں۔ ہاں البتہ رانی کے ساتھ کبھی کبھار کھٹ پٹ ہو جاتی ہے سُسرال والے اپنی بیٹی کی طرف داری کرتے ہوئے مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے۔ لیکن میں نے کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ یہ سوچ کر ہر واقعہ فراموش کر دیتی کہ ہم عمر ہونے کے ناطے کسی بات پر اختلاف ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس نہج تک میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ان حالات کی تمام تر ذمہ داری مجھ تک آ سکتی ہے۔

یہ خیال آتے ہی میرا رواں رواں کانپ اُٹھتا اور ایک جھرجھری سی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر جاتی۔ اگر جاوید نے اپنے الفاظ کو حقیقی رُوپ دے دیا جو اُنھوں نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہے تو میں کیا منہ لے کر والدین کے پاس جاؤں گی۔ اس معاشرے کا کیسے تنہا مقابلہ کروں گی جہاں طلاق عورت کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہے وہ بدنما داغ ہے جو سات سمندروں کے پانی سے بھی نہیں دھویا جا سکتا۔ قصور مرد کا ہو تو بھی عورت بدنام خطا عورت کرے تو زندہ درگور یہ سوچیں مجھے ہلکان کئے جا رہی تھیں۔ اسی کشمکش میں چار پانچ ماہ بیت گئے اس عرصہ میں جاوید نے ایک آدھ خط لکھا وہ بھی برائے نام۔ ان کا رویہ میرے لئے سوہان روح تھا۔

ایک دن حسب معمول باورچی خانہ میں روزمرہ کام میں مشغول تھی دروازے پر مخصوص دستک نے چونکا دیا۔ ڈاکیے کی آمد کا وقت تھا۔ میری ساس نے آ کر مجھے دروازے تک جانے کو کہا تمہارے نام پر رجسٹرڈ خط ہے وہ تمھیں دینا چاہتا ہے میں حیرانگی اور انجانے خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ دروازے تک گئی۔ ڈاکیے سے رجسٹرڈ خط میری طرف بڑھاتے وصولی کی رسید پر دستخط کرنے کو کہا۔ دستخط کرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر رعشہ سا طاری ہو گیا اور معاً جاوید کے کہے ہوئے الفاظ کانوں کے پردے پھاڑنے لگے شدت جذبات سے ہونٹ کپکپانے لگے چہرہ زرد اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا مجھے اپنی دُنیا ویران ہوتے ہوئے نظر آنے لگی۔ ہاتھوں میں سکت نہ رہی رجسٹرڈ لفافہ پکڑتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دو سو گرام کا لفافہ مجھے دو سو ٹن کا محسوس ہو رہا تھا۔ جسے اُٹھانا میرے قوت برداشت سے باہر تھا۔ اشکوں کا سیل رواں تھا جو میری آنکھوں سے جاری تھا کسی طور بھی نہ تھم رہا تھا۔ میری ساس اتنی دیر تک میرے پیچھے آ چکی تھی۔ مجھے یکدم ہیجانی حالت میں روتی دیکھ کر گھبرا گئی رونے کی وجہ پوچھی میں اور بھی شدت سے رونے لگی۔ میں اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جاوید اس حد تک گر جائے گا۔ آج مرد ذات پر سے بھروسہ اُٹھتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ یہ مرد بھی کتنا ہرجائی ہے ساتھ نبھانے کے لئے کتنی قسمیں کھاتا ہے۔ زندگی بھر کا بندھن دو پل میں کتنی آسانی کے ساتھ توڑ دیتا ہے۔ جبکہ یہی بندھن باندھنے میں کتنے مراحل سے گذرنا

پڑتا ہے اس سے زیادہ بیوفائی کیا ہوگی۔ کبھی کبھی انسان اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کی خاطر وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جو انسانیت کی توہین ہے۔

سُسر کو بھی گھر بُلا لیا گیا۔ وہ بھی اس غیر متوقع واقعہ سے متاثر ہوئے مجھے برابر تسلیوں سے اپنی حمایت کا یقین دلا رہے تھے اور جاوید کو ہی بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ادھر میرے دل میں جاوید کی بے وفائی کے سبب نفرت کے الاؤ دہک رہے تھے۔ ہنگامی طور پر برادری کے چند بزرگوں کو بھی مل بیٹھ کر کوئی حل نکالنے کے لئے بُلا لیا گیا۔

رات کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ میرے مقدر کی سیاہی اور بھی سیاہ ہوتی جارہی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدی کا محسوس ہو رہا تھا۔ دن تھا کہ ڈھلنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ آخر کار رات ہوئی برادری کے سمجھدار جہاندیدہ بزرگ بیٹھے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے ان میں سے ایک بزرگ نے واقعہ پوچھا میں نے من وعن سُنا دیا کہ مجھے ان الفاظ میں طلاق کی دھمکی دی تھی۔ پھر اُنھوں نے لفافہ چاک کرنے کو کہا۔ لفافے کو نہایت احتیاط اور آہستہ آہستہ کھولا جا رہا تھا مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دِل پر کوئی آہستہ آہستہ نشتر چلا رہا ہے۔ میں ایک طرف بیٹھی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے موجود تھی۔ لفافہ چاک کرنے پر چند کاغذات برآمد ہوئے اجنبی تحریر کے باعث پڑھنا ممکن نہ رہا۔ وہ لوگ خاموش ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اس سے قبل ان کی خاموشی میرے لیے جان لیوا ہوتی معاً کاغذ اُلٹنے پلٹنے سے ایک کاغذ نیچے گرا۔ میرے نام دیکھ کر میری طرف بھیج دیا میں اس قدر مایوس اور بددل ہو چکی تھی کہ کاغذ کی طرف دیکھنا گوارا بھی نہ کیا۔ ساس کے اصرار پر مجھے پڑھنا پڑا تاکہ ان کو صورت حال کا علم ہو سکے۔ لکھا تھا!

ذیئر ناہید! اس بار رُخصت کے ایام نہایت کرب میں گذرے۔ والدین کی نافرمانی بھی نہیں کر سکتا اور آپ کی پُرخلوص محبت سے چھٹکارا بھی نہیں۔ کافی غور و غوض کے بعد فیصلہ کیا ہے تم میرے پاس چلی آؤ۔ ویزہ ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے میرے اس فیصلے سے تمہیں راحت ہوگی۔

تمہارا جاوید

خط پڑھتے ہی میں شرم کے مارے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔ کِسی کو بھلا کیا جواب دیتی۔

☆☆☆☆☆

نیم کا درخت

وہ شہر کی سب سے پرانی گلی تھی، جسے لوگ ''نیم والی گلی'' کہتے تھے کیونکہ اس کے سرے پر ایک نیم کا گھنا درخت تھا جس کی سرسبز شاخیں یہاں وہاں پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ درخت برسوں سے وہیں کھڑا تھا، جیسے کئی زمانوں کا خاموش گواہ ہو۔ اسی گلی کی نکڑ پر ڈاکٹر نسرین کا کلینک تھا۔ جس کی سفید دیواروں پر سالوں کی دھوپ نے ہلکا پیلا پن چڑھا دیا تھا۔ دیواروں سے لٹکتے نیلے پردے ہوا میں ہلتے تو اندر کی ٹھنڈک کا احساس باہر تک آتا۔ دروازے پر نیلی تختی:

''ڈاکٹر نسرین فاطمہ --- ایم بی بی ایس، گائناکالوجسٹ۔''

علاقے میں اس کی قابلیت کا ڈنکا بجتا تھا۔ لیکن سچ یہ تھا کہ دور دراز کے گاؤں کی عورتیں عموماً کلینک تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ ان کے گاؤں میں دائیاں موجود تھیں۔ بوڑھی، تجربہ کار دائیاں، جن کے ہاتھوں نسلوں کا جنم ہوا تھا۔ وہی سہاگ کی رات کی گواہ، وہی جنم کی گواہ اور کبھی کبھی موت کی بھی۔ عورتیں انھیں ڈاکٹر سے زیادہ جانتی تھیں، ان پر ڈاکٹر سے زیادہ اعتبار کرتی تھیں۔ لیکن جب بات دائی کے بس کی نہ رہتی اور جب بچہ الٹا پڑ جاتا، خون نہ رکتا، درد حد سے بڑھ جاتا، تب وہ کہتیں:

''اسے شہر لے جاؤ، ڈاکٹر نسرین کے پاس۔''

اور تب وہ حاملہ عورتوں کو لاتے تھے، ٹوٹی چارپائیوں پر لدے ہوئے، خاوندوں کے کندھوں کا سہارا لیے ہوئے، آنکھوں میں درد اور ہونٹوں پر دعا۔ اکثر دیر ہو چکی ہوتی تھی۔

لیکن کلینک کے اندر ایک سخت اصول تھا۔

عمران شاہد

لکھا نہیں گیا تھا، دیواروں میں چنا ہوا تھا، نرسوں کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا، ڈاکٹر نسرین کے لہجے کی سختی میں ڈھلا ہوا تھا:

''پہلے فیس، پھر علاج۔''

ڈاکٹر نسرین خود بھی غربت گزار کے آئی تھی، یہ بات کم ہی لوگ جانتے تھے۔ باپ ایک سرکاری کلرک تھا، گھر میں پانچ بہن بھائی، فیس کے لیے رشتہ داروں کے در کھٹکھٹانے کی ذلت اس نے بھگتی تھی۔ ڈاکٹری کی پڑھائی ادھار پر ہوئی تھی۔ ایک چاچے کا قرض، ایک ماموں کا احسان، ایک پھوپھی کا طعنہ۔ ہر امتحان سے پہلے فکر لاحق ہوتی تھی۔ کتابوں کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ گھر والوں نے کہہ رکھا تھا:

''ڈاکٹری کر کے کیا کرے گی؟ بیاہ کر لو۔'' مگر وہ ڈٹی رہی۔

پھر وہ دن آیا جب اس نے اپنا کلینک کھولا۔ ''ڈاکٹر نسرین فاطمہ کلینک'' قرض لے کر، گھر کے زیور گروی رکھ کر، اپنے شوہر کی کئی تنخواہیں داؤ پر لگا کر۔ اس نے اس دن خود سے عہد کیا تھا:

''اب کوئی ذلت نہیں، اب کوئی دروازہ نہیں کھٹکھٹانا۔ پیسہ اس کے لیے صرف دولت نہیں تھا، پیسہ اس کے لیے وہ ڈھال تھی جو اسے اس پرانی ذلت سے بچاتی تھی جو اس نے بچپن میں جھیلی تھی۔ اس نے غربت کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ وہ اس سے اس طرح بھاگتی تھی جیسے کوئی آگ سے۔ اور جو اس کے راستے میں غریب لے کر آتا، وہ بھی اسے آگ کی طرح لگتا تھا۔

اس رات بارش ہو رہی تھی۔ وہ بارش جو اکتوبر کے آخر میں ہوتی ہے۔ ٹھنڈی، بے رحم، بغیر کسی اطلاع کے۔ گلیاں کیچڑ سے بھر گئی تھیں، بجلی کے کھمبوں پر لگے بلب پانی میں اپنا عکس دیکھ رہے تھے، اور نیم کا درخت بھیگ بھیگ کر اپنے پتے گرا رہا تھا۔

رمضان دن بھر سے خوفزدہ تھا۔ اس کی گھر والی زرینہ کا درد صبح سے بڑھ رہا تھا۔ کبھی ہلکا، کبھی تیز، لیکن رکتا نہیں تھا۔ گاؤں کی تجربہ کار دائی صغرا بی بی نے ہاتھ لگائے مگر ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے رمضان کو بلایا، آواز دھیمی تھی لیکن آنکھوں میں گھبراہٹ صاف تھی:

''بچہ الٹا پڑا ہے۔ میرے بس کا نہیں ہے۔ کرماں والی کو شہر لے جا، ڈاکٹر نسرین کے پاس۔ جلدی کر، رات نہ ہو جائے۔''

لیکن رات ہو گئی تھی۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام کرتے کرتے، راستے میں کیچڑ کی وجہ سے رکتے رکاتے رات ہو گئی تھی۔ رمضان اس

رات کلینک کی دہلیز پر پہنچا تو اس کے گیلے کپڑے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ دبلا پتلا کسان، مٹی رنگ چہرہ، گالوں پر ہڈیاں ابھری ہوئی، ہاتھوں کی لکیروں میں کھیتوں کی مٹی۔ اپنی بیوی زرینہ کو بانہوں میں اٹھائے ہوئے تھا۔

زرینہ کا سر اس کے کندھے پر تھا۔ وہ دونوں آٹھ سال سے ساتھ تھے۔ آٹھ سال کی وہ زندگی جس میں سوکھے کھیت بھی تھے، ادھار کا آٹا بھی، لیکن رات کو چارپائی پر لیٹ کر زرینہ کا یہ کہنا بھی تھا:

''اللہ نے بہت کچھ دیا ہے رمضان، شکر کرو۔''

رمضان کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس چیز کا شکر کرتی ہے۔ شاید اسی کا، شاید اس چھوٹی سی زندگی کا جو انھوں نے مل کر بنائی تھی۔ اور اب وہ اس کی بانہوں میں تھی، سانسیں اکھڑ رہی تھیں، ہونٹ خشک تھے۔ نو مہینوں کا بوجھ اس کے وجود کو توڑ رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ---''

رمضان نے نرس کو دیکھتے ہی کہا، آواز میں التجا اور سانس میں تھکاوٹ گھلی ہوئی تھی۔

دائی نے بھیجا ہے۔ کہا بچہ الٹا پڑا ہے، آپ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ راستے میں دو بار بے ہوش ہوئی۔ اللہ کے واسطے میری زرینہ کو بچا لیں۔''

نرس نے ایک نظر زرینہ پر ڈالی۔ نظروں میں کچھ تھا جو وہ چھپانا چاہتی تھی مگر نہ چھپا سکی۔ اس نے رجسٹر کھولا اور بولی:

''پہلے فیس جمع کروائیں۔''

رمضان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لفافے میں بند نوٹ نکالے اور ایک ایک کر کے کانپتی انگلیوں سے گننے لگا۔

''یہ تو آدھی رقم ہے۔'' نرس کی آواز نے رمضان کی سماعتوں کو چیر دیا۔

''باقی ابھی لاتا ہوں۔'' اس نے کہا، آواز میں وہ شرم تھی جو غریب آدمی تب محسوس کرتا ہے جب اپنی بے بسی کسی اجنبی کے سامنے رکھنی پڑے۔ قریب ہی چاچا رحیم کا گھر تھا، جس سے وہ اکثر کھاد لینے آتا تھا۔ پرانی جان پہچان تھی۔

''میری زرینہ کو اندر لے لو، میں ابھی آتا ہوں۔'' رمضان نے نرس سے کہا

''پہلے پوری فیس جمع ہوگی، پھر مریض اندر آئے گا۔''

اچانک اندر سے آواز آئی۔ شاید وہ ڈاکٹر نسرین تھی جو باہر نہیں آئی، مریضہ کو دیکھا تک نہیں، بس پردے کے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

رمضان ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اس

نے زرینہ کو انتظار گاہ کی بینچ پر لٹایا آہستہ سے، جیسے کوئی نازک چیز رکھتا ہے۔

زرینہ نے درد میں آنکھیں کھولیں۔ اس کی نظر رمضان پر پڑی۔ اس کا چہرہ دیکھا، بھیگا ہوا، ڈرا ہوا اور تھکا ہوا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور رمضان کے کاندھے پر رکھ دیا۔

''جلدی آنا۔''

زرینہ کی نحیف آواز ابھری اور ایک لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ اور پھر جیسے اچانک کچھ یاد آیا ہو، اس نے کہا:

''اگر بیٹا ہو--- تو سلیم نام رکھنا۔''

رمضان کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے زرینہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کے تسلی دی اور بارش میں نکل گیا۔

چاچا رحیم کا گھر تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ رمضان دوڑتا گیا۔ کیچڑ میں پھسلتا، ٹھوکریں کھاتا، بارش میں بھیگتا۔ ایک بار گرا، گھٹنا چھل گیا، اٹھا اور پھر چل پڑا۔

چاچا رحیم نے دروازہ کھولا تو رمضان کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

''رمضو تو؟ خیر تو ہے--- کیا ہوا؟''

''میری گھر والی --- ڈاکٹر کے کلینک میں ہے۔ کچھ پیسے ضرورت ہیں، بس تھوڑے سے۔''

چاچا رحیم نے بغیر ایک لفظ کہے اندر سے پیسے لا کر رمضان کی مٹھی میں رکھ دیے اور کہا:

''میری ضرورت ہو تو بتاؤ۔''

''نہیں چاچا رحیمو--- تیری مہربانی۔''

رمضان واپس کلینک بھاگا۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی لیکن ہوا اور تیز ہو ہڈیوں کے آر پار ہو رہی تھی۔

کلینک کا دروازہ کھلا تھا۔ انتظار گاہ میں نرس کھڑی تھی۔ آنکھیں سرخ، ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا وجود، کپڑے میں لپٹا ہوا، آنکھیں بند، دنیا سے بے خبر۔

رمضان کے قدم رک گئے۔

''زرینہ---؟'' اس نے آواز دی مگر اس کا لہجہ ٹوٹ گیا۔ نرس کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہ نکلی۔ اس نے بچے کو آگے کیا۔

''بیٹا ہوا ہے۔'' آواز ٹوٹی ہوئی تھی۔

''زرینہ بی بی نہیں رہیں۔ ہم نے بچے کو بچا لیا۔''

رمضان کی مٹھی سے نوٹ فرش پر گر گئے۔ ایک ایک کر کے، وہی نوٹ جو اس نے بارش میں بھیگ کر، ٹھوکریں کھا کر کسی سے لیے تھے۔

اس نے بچے کو اٹھایا۔ اپنے سینے سے لگایا۔ بچہ زندگی سے بھرا ہوا، سانس لیتا ہوا، اتنے

بڑے حادثے سے بے خبر تھا جو پہلی سانس لیتے ہی اس پر بیت چکا تھا۔ رمضان ٹھنڈا تھا، اس قدر ٹھنڈا جیسے کوئی چیز اس کے اندر بجھ گئی ہو۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا، اسی بینچ کے سامنے جہاں زرینہ نے اس کا کاندھا پکڑا تھا تھا۔ اس کی آواز وہاں ابھی بھی گونج رہی تھی:

''اگر بیٹا ہو تو سلیم نام رکھنا۔''

وہ نہ رویا، نہ چیخا، نہ کچھ بولا۔ بس سلیم کو سینے سے لگائے زرینہ کی لاش کے سرہانے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ صبح کو وہ باہر نکلا تو بارش تھم چکی تھی۔ نیم کا درخت چپ چاپ کھڑا تھا، جیسے وہ بھی سوگ میں ڈوبا ہوا ہو۔ ڈاکٹر نسرین نے انتظار گاہ سے گزرتے ہوئے اس خالی بینچ کو دیکھا، جیسے وہاں کسی کی سانسیں بکھری پڑی ہوں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے قدم رکے مگر وہ نظریں پھیر کے چلی گئی۔

رمضان نے سلیم کو ویسے ہی پالا جیسے کسان بیج بوتا ہے اور پودوں کو پالتا ہے۔ تھوڑی مٹی، تھوڑا پانی اور بہت ساری دعا کی روشنی۔ سلیم ہوشیار تھا۔ باپ کی آنکھوں میں چھپی صداقت اس نے پڑھ لی تھی۔ دوسری کی زبان سے ہوتی ہوئی اس کی ماں کی یادیں سلیم کے دل میں جمع ہوتی گئیں۔ رمضان نے ایک بار بتایا تھا کہ اس کی ماں کا مرنا ضروری نہیں تھا، وہ بیماری سے نہیں، ڈاکٹر کی سنگدلی سے مری تھی۔ یہ بات سلیم کے ذہن میں اس طرح اتری جیسے لوہے پر گرم نشان۔

اس نے پڑھائی سے کبھی منہ نہ موڑا۔ باپ کا خواب تھا، ماں کی قربانی تھی، اپنی قابلیت تھی۔ اسے وظیفہ ملا، کالج میں داخلہ ہوا اور وہ شہر آ گیا۔

اسی کالج میں ماہ نور تھی۔ ڈاکٹر نسرین فاطمہ کی بیٹی۔ اکیسویں سال میں، گلاب جیسی، باپ کی آنکھیں اور ماں کی ذہانت۔ ادب کی طالبہ، شعر لکھتی، کتابیں پڑھتی، ڈائری میں اپنے خواب محفوظ کرتی۔

سلیم کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ ماہ نور کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس کی ماں کا زخم اس کے دل میں کس نے لگایا تھا۔

وہ ایک دوسرے کو محض اپنی کلاس میں جانتے تھے۔ شاید اس دن سے جب سلیم نے لائبریری میں اس کی کتابیں ڈھونڈنے میں مدد کی تھی۔ یا شاید اس دن سے جب بارش میں دونوں نے کالج کے برآمدے میں کھڑے ہو کر بات کی تھی اور وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ سلیم ماہ نور کی باتیں ایسے سنتا تھا جیسے دنیا میں اس وقت کوئی اور بات ہو

ہی نہیں رہی۔ ماہ نور نے ڈائری میں لکھا:

''کوئی ہے جو مجھے سنتا ہے۔''

پھر وہ دن آیا، جسے شاید نہیں آنا چاہیے تھا۔ کالج کے ایک فنکشن میں ماہ نور کی مما آئی تھی، ڈاکٹر نسرین فاطمہ، گائنا کالوجسٹ، نیم والی گلی کی ڈاکٹر۔ سٹیج پر جب تعارف ہوا تو سلیم دکھ سے بھیگ گیا۔

''ڈاکٹر نسرین فاطمہ۔''

''نیم والی گلی۔''

سلیم کا رنگ سفید پڑ گیا۔ اس نے آدھی رات کو باپ کو فون کیا۔

''ابو۔۔۔ ماہ نور کی امی ڈاکٹر نسرین فاطمہ ہے۔''

فون پر خاموشی رہی۔ پھر رمضان کی بوڑھی آواز آئی۔

''بھول جا بیٹا۔۔۔ اللہ مالک ہے۔''

سلیم کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو عورت اس کی ماں کو بینچ پر مرنے کے لیے چھوڑ گئی تھی، اس کی بیٹی کے ساتھ وہ۔۔۔

''ایک طرف سنگدل عورت کی بیٹی تھی اور دوسری طرف بینچ پر تڑپتی ایک اکیلی بے یار و مددگار ماں۔''

کچھ زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ محبت جیسے جذبے کو بھی چاٹ جاتے ہیں۔ اس نے ماہ نور سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ پھر ایک دن ماہ نور ملی۔ اصرار کر کے، التجا کر کے اس سیپو چھا اور اس نے اسے سچ بتا دیا:

''درد سے تڑپتی عورت۔۔۔ بینچ۔۔۔ فیس۔۔۔ سنگدل ڈاکٹر نسرین فاطمہ۔۔۔''

ماہ نور نے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ بس کھڑی رہی۔ اس طرح جیسے کسی نے اچانک زمین کھینچ لی ہو اور وہ ہوا میں معلق ہو۔ پھر وہ چلی گئی۔

ڈاکٹر نسرین کے گھر میں خاموش طوفان آ چکا تھا۔ ماہ نور نے کسی کو کچھ نہیں بتایا، نہ سلیم کا نام، نہ اس کی ماں کی کہانی۔ وہ اندر ہی اندر بجھ گئی تھی۔ مہینے گزرتے گئے۔ ڈاکٹر نسرین نے سوچا، شاید پڑھائی کا بوجھ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ کچھ لوگ ٹوٹ جاتے ہیں، ٹھیک نہیں ہوتے۔

وہ صبح عام صبحوں جیسی تھی۔ ماہ نور نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس نے عرصہ سے نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن اس صبح پڑھی۔ پھر اپنی پسندیدہ کتاب اٹھائی، دیوانِ غالب اور ایک شعر پر انگلی ٹھہر سی گئی:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کتاب بند کی اور ایک طرف رکھ دی۔
کھڑکی کھولی۔ باہر پرندے بول رہے تھے۔
اس نے ایک گہری سانس لی، جیسے سارے منظر اپنے اندر بھر لینا چاہتی ہو۔ پھر اپنی ڈائری کھولی۔ آخری صفحے پر لکھا::

''امی، آپ نے ہمیشہ کہا کہ غریبی سب سے بڑا عیب ہے۔ سلیم غریب ضرور تھا مگر اس نے مجھے یہ عیب کبھی محسوس نہیں ہونے دیا جو عیب آج میں آپ کی امیری کی وجہ سے محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے آج پتہ چلا کہ غربت عیب نہیں، امیری عیب ہے جو آپ کا دیا ہوا ہے۔ ہم نے کسی سے کچھ چھین لیا تھا، سلیم بھی انہی میں سے ایک ہے۔ میں اس عیب کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔''

ڈائری بند کی۔ الماری کی اوپر والی شیلف سے وہ چھوٹی شیشی نکالی جو اس نے چھپا کر رکھی تھی۔ اسے ہاتھ میں لیا، کچھ دیر دیکھتی رہی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

دوپہر کو ڈاکٹر نسرین کلینک میں تھی۔ آپریشن تھیٹر میں ایک مریضہ کا بھاری فیس کے بدلے بڑا آپریشن جاری تھا۔ آج کا دن اچھا جا رہا تھا۔

اچانک کلینک کا فون بج اٹھا۔

''بی بی جی، ماہ نور نے کچھ کھا لیا ہے۔ جلدی آئیں۔ بہت جلدی۔''

ڈاکٹر نسرین کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ دل میں کچھ کھنچا۔ لیکن میز پر مریضہ تھی۔ آپریشن آدھا ہوا تھا۔ فیس بڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پھر سے تیزی سے چلنے لگے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچی تو ماہ نور بستر پر ساکت و جامد پڑی تھی۔ آنکھیں بند، ہونٹوں پر خشک خون کے نشان، چہرہ اس قدر پرسکون جیسے سو رہی ہو۔

شوہر کونے میں کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خاموش، چپ چاپ۔ ڈاکٹر نسرین نے بیٹی کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔ وہ ہاتھ جنھوں نے ہزاروں مریضوں کو چھوا تھا، جو کبھی نہیں کانپے تھے مگر اس وقت برف کی طرح ٹھنڈے تھے اور کانپ رہے تھے۔

''ماہ نور۔۔۔''

کوئی جواب نہ آیا۔

''ماہ نور، بیٹا۔۔۔''

خاموشی چھائی رہی۔

میز پر ڈائری پڑی تھی۔ کھلی ہوئی، آخری صفحے پر۔ ڈاکٹر نسرین کی نظر اس پر گئی۔ پڑھنا شروع کیا۔۔۔ ایک لفظ ایک لفظ

''ہم نے کسی سے کچھ چھین لیا تھا۔۔۔''

اس کے ہاتھ ڈائری پر رک گئے۔ رات بھر وہ وہیں بیٹھی رہی، فرش پر، بیٹی کا ہاتھ

تھا مے، جیسے سلیم کا باپ اس کی ماں روزینہ کی لاش پر بیٹھا رہا تھا۔ شوہر نے کئی بار کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن کچھ نہ کہا۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

باہر دھوپ ڈھل گئی تھی اور اندھیرا آ گیا تھا، وہ اندھیرا جو اس گھر سے پھر کبھی رخصت نہ ہوا۔

کچھ دن بعد نیم والی گلی کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ نیم کے درخت کے پہلو میں کلینک کے آگے اہلِ علاقہ کا ہجوم تھا جن کے چہروں پر حیرت کھلی ہوئی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ محلے کے چند بزرگ، کلینک کا پرانا سٹاف اور کچھ مریض بھی تھے۔ ڈاکٹر نسرین نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے پر شگفتگی، آنکھیں سوجی ہوئی۔ شوہر بھی ایک طرف کھڑا تھا۔

کلینک کے دروازے پر ایک بڑا سا بورڈ لگایا جا رہا تھا، جس پر لکھا تھا:

''ماہ نور میموریل کلینک''

یہاں غریب مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے''۔''

لوگ حیران تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ یہ کیسے ہو گیا؟

''سنا ہے بیٹی کے محبوب کی ماں اسی کلینک میں مری تھی۔''

کسی کی دبی دبی آواز ابھری

''دیکھتے ہیں کتنے دن چلتا ہے یہ سب۔''

کسی نے طنزیہ تیر چھوڑا۔

برسوں بیت گئے۔ شہر کی نیم والی گلی میں اب بھی ڈاکٹر نسرین کا کلینک ہے۔ سفید دیواریں، نیلے پردے۔ دروازے پر وہی بورڈ، اور اس کے نیچے ماہ نور میموریل کی چھوٹی سی تختی۔ لوگ کہتے ہیں ڈاکٹر نسرین بدل گئی ہے۔

شاید کچھ زخم آدمی کو بدلتے نہیں، بس توڑ دیتے ہیں۔

لیکن ایک چیز ضرور بدل گئی'' وہ بینچ''

انتظار گاہ کی اس بینچ پر اب کوئی نہیں بٹھایا جاتا۔ نرسوں نے کبھی نہیں پوچھا کیوں۔ ڈاکٹر نسرین جب بھی اس بینچ کے پاس سے گزرتی ہے تو کبھی کبھی رک جاتی ہے، بس ایک لمحے کے لیے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس ایک لمحے میں اسے کیا نظر آتا ہے۔ کوئی تڑپتی ہوئی ماں، بھیگا ہوا کوئی لاچار باپ یا پیٹ کے ابھار میں کلبلاتا ہوا کوئی بچہ۔

نیم کا برسوں پرانا درخت اب بھی وہیں پر کھڑا ہے، گلی کے سرے پر، خاموش، جھکا ہوا۔

کہتے ہیں درخت سب کچھ یاد رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

دھوپ کے پار ایک سایہ

نعمان منظور

گاؤں کے کنارے ایک پرانا پیپل کا درخت تھا جو صرف ایک درخت نہیں بل کہ وقت کی ایک طویل داستان تھا۔ اس کی جڑیں زمین میں جتنی گہری تھیں اتنی ہی گہری اس کے سائے میں دبے ہوئے انسانی خواب تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ درخت خاموش نہیں ہے، یہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، اور وقت آنے پر یاد بھی رکھتا ہے۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب زمین جل رہی ہوتی تو اس کے نیچے بیٹھنے والا ہر شخص جیسے اپنے اندر کی تھکن کو باہر چھوڑ دیتا۔ سردیوں میں اس کی شاخیں خاموش دعا کی طرح آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور خزاں میں اس کے پتے یوں گرتے جیسے وقت اپنے ہی لفظ توڑ رہا ہو۔

اسی درخت کے سائے میں ایک دن حمید نے خود کو پہلی بار محسوس کیا تھا۔ وہ اس وقت کم عمر تھا، خواب اس کی آنکھوں میں نہیں بل کہ اس کے لہجے میں رہتے تھے۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ وہ شہر جائے گا، وہاں اپنی تقدیر بدل لے گا۔ گاؤں کے لوگ مسکراتے تھے مگر اسے روکنے کی کوشش نہیں کرتے تھے

کیونکہ نوجوان خواب کو روکا نہیں جا سکتا، صرف دیکھا جا سکتا ہے۔

حمید شہر چلا گیا۔ ماں نے جاتے وقت اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں دیا تھا، صرف دعا دی تھی جو بظاہر ہلکی تھی مگر وقت کے ساتھ بہت بھاری ثابت ہوئی۔ باپ خاموش تھا، جیسے اس کے پاس لفظ کم اور تجربہ زیادہ ہو۔ گاؤں کی مٹی اس کے جوتوں سے جھڑ رہی تھی مگر دل کے اندر وہی مٹی کہیں جمی رہی۔

شہر پہنچ کر حمی کو احساس ہوا کہ یہاں روشنی صرف آنکھوں کو نہیں چبھتی بل کہ امید کو بھی جلاتی ہے۔ بلند عمارتیں اس کے خوابوں سے کہیں زیادہ اونچی تھیں اور لوگ اس سے کہیں زیادہ تیز چلتے تھے جتنا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس نے نوکری ڈھونڈی، چھوٹے چھوٹے کام کیے، کبھی کسی دفتر کے باہر انتظار کیا اور کبھی کسی دکان کے کونے میں بیٹھ کر وقت گنوایا۔ ہر دن اس کے اندر کچھ ٹوٹتا تھا مگر وہ ہر صبح نئے حوصلے کے ساتھ اُٹھتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ وہ تھکنے لگا مگر رکتا نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شہر میں انسان کا ہونا کافی نہیں، یہاں انسان کو کچھ اور بھی ہونا پڑتا ہے جس کا نام شاید قسمت نہیں، مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ ایک دن ایسا آیا کہ اس کے پاس نہ پیسے بچے نہ امید۔ وہ ایک خاموش فیصلہ لے کر واپس گاؤں آ گیا۔

گاؤں نے اسے ویسے دیکھا جیسے کوئی پرانی کتاب دوبارہ کھل گئی ہو مگر صفحات کچھ پھٹے ہوئے ہوں۔ کچھ لوگ حیران تھے، کچھ خاموش، اور کچھ نے صرف سر جھکا لیا۔ حمید سیدھا پیپل کے درخت کے پاس گیا۔ وہی جگہ جہاں اس نے بچپن میں خواب دیکھے تھے۔ اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے جیسے خود کو زمین کے حوالے کر دیا۔

وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ زمین کی نمی اس کی تھکن کو جیسے اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ تب ایک آواز آئی۔

''تم واپس آ گئے؟''

یہ نرگس تھی۔

وہ گاؤں کی وہ لڑکی تھی جو ہمیشہ خاموش رہ کر بھی بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال بھی تھے اور جواب بھی مگر وہ دونوں کبھی جلدی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ وہ حمید کو بچپن سے جانتی تھی مگر وقت نے دونوں کے درمیان ایک غیر مرئی فاصلہ لکھ دیا تھا۔

حمید نے سر اٹھایا اور دھیرے سے کہا کہ ہاں وہ واپس آ گیا ہے مگر شاید وہ خود کو وہیں

چھوڑ آیا ہے جہاں وہ گیا تھا۔ نرگس نے اس کے چہرے کو دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر وہ بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ گئی جیسے دونوں کے درمیان خاموشی اب ایک مشترکہ جگہ بن گئی ہو۔

دن گزرتے گئے۔ حمید نے گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اب ایسا نہیں رہا تھا جیسا پہلے تھا۔ شہر نے اسے توڑا ضرور تھا مگر مکمل ختم نہیں کیا تھا۔ اس نے بچوں کو پڑھانا شروع کیا۔ گاؤں کے کچے راستے پر اب اس کے قدم کسی مقصد کے ساتھ پڑنے لگے۔ وہ حروف سکھاتا، حساب سمجھاتا اور کبھی کبھی زندگی کے وہ سبق بھی بتاتا جو کسی کتاب میں نہیں ہوتے۔

نرگس اکثر آتی۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی مگر اس کی موجودگی ایک مکمل جملہ ہوتی تھی۔ حمید کو اس کی خاموشی میں ایک عجیب سکون ملتا تھا۔ کبھی وہ کہتا کہ شہر نے اسے بہت کچھ دیا مگر سب کچھ چھین کر۔ نرگس جواب میں کہتی کہ شاید کچھ چیزیں چھننا ہی ان کے ملنے کا پہلا راستہ ہوتا ہے۔ حمید آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ اس کے اندر کی شکست ایک سمجھ میں بدلنے لگی۔ وہ اب اپنے ماضی سے بھاگتا نہیں تھا بلکہ اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ شہر نے اسے نہیں توڑا تھا بلکہ اس کے خوابوں کی سمت درست کی تھی۔ وہ خواب جو صرف اونچائی چاہتے تھے اب گہرائی بھی سیکھ رہے تھے۔

ایک دن جب شام کا سورج گاؤں کے کھیتوں پر سنہری روشنی بکھیر رہا تھا حمید اور نرگس پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ ہوا میں ایک عجیب سی نرمی تھی جیسے وقت بھی تھک کر بیٹھ گیا ہو۔

نرگس نے پوچھا کہ اگر وہ شہر نہ جاتا تو کیا ہوتا۔ حمید نے کچھ دیر سوچا اور کہا کہ شاید وہ وہی ہوتا جو وہ سمجھتا تھا کہ وہ ہے مگر وہ کبھی وہ نہ بنتا جو وہ بن سکتا تھا۔ نرگس نے پھر پوچھا کہ اگر وہ واپس نہ آتا تو۔ اس بار حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا کہ شاید وہ خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔

ان دونوں کے درمیان اب وہ خاموشی نہیں تھی جو اجنبیت پیدا کرتی ہے بلکہ وہ خاموشی تھی جو سمجھ بن جاتی ہے۔ وقت گزرتا گیا اور موسم بدلتے گئے۔ گاؤں میں زندگی اپنی دھیمی رفتار سے چلتی رہی مگر حمید کے اندر ایک نئی رفتار پیدا ہو گئی تھی۔

بارشوں کا موسم آیا تو گاؤں کی مٹی خوشبو دینے لگی۔ ایک دن موسلادھار بارش ہو رہی

تھی۔ پیپل کے درخت کے پتے بھیگ کر جھک گئے تھے جیسے دعا میں سر جھکا دیا ہو۔ حمید اور نرگس درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ پانی زمین پر گر کر جیسے پرانی کہانیاں دھو رہا تھا۔

نرگس نے آہستہ کہا کہ زندگی سیدھی نہیں ہوتی۔ حمید نے جواب دیا کہ سیدھی نہ ہو تو شاید زیادہ سچی ہوتی ہے۔ دونوں مسکرائے مگر یہ مسکراہٹ ہلکی تھی، گہری تھی، اور دیرپا تھی۔

اس کے بعد حمید نے گاؤں میں ایک چھوٹا سا تعلیمی مرکز شروع کیا۔ اب وہ صرف استاد نہیں تھا بل کہ ایک ایسا انسان تھا جس نے زندگی کو پڑھ لیا تھا۔ اس کی باتوں میں اپنا تجربہ تھا، اس کی خاموشی میں سمجھ تھی۔ لوگ اس کے پاس آتے اور صرف پڑھنے نہیں بل کہ سمجھنے کے لیے بیٹھتے۔

نرگس اب بھی آتی تھی مگر اب اس کی خاموشی کم ہو گئی تھی۔ کبھی وہ ہنستی تھی، کبھی بات کرتی تھی، اور کبھی صرف سنتی تھی۔ دونوں کے درمیان اب کچھ کہنے کی حاجت کم ہو گئی تھی کیونکہ بہت کچھ کہہ دیا گیا تھا بغیر لفظوں کے۔

ایک دن حمید نے کہا کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ واپس آ گیا ہے مگر اب اسے لگتا ہے کہ وہ پہلی بار پہنچا ہے۔ نرگس نے پوچھا کہاں۔ حمید نے پیپل کے درخت کی طرف دیکھا اور کہا اپنے آپ تک۔

وقت گزرتا رہا۔ گاؤں ویسا ہی رہا مگر کچھ چیزیں بدل گئی تھیں۔ پیپل کا درخت اب بھی وہیں تھا مگر اب وہ صرف سایہ نہیں دیتا تھا بل کہ یاد دلاتا تھا کہ انسان گم ہو کر بھی واپس آ سکتا ہے مگر پہلے جیسا نہیں رہتا۔

حمید اب وہ انسان نہیں تھا جو شہر گیا تھا اور ٹوٹ کر واپس آیا تھا۔ وہ اب وہ تھا جو سمجھ کر جڑ گیا تھا۔ اس کے اندر اب سکون تھا مگر وہ سکون مردہ نہیں تھا بل کہ زندہ تھا۔

نرگس اب بھی اس کے ساتھ تھی مگر اب وہ صرف ایک موجودگی نہیں تھی بل کہ ایک مکمل سمجھ تھی۔ دونوں کے درمیان ایک ایسا تعلق بن چکا تھا جو نہ مکمل محبت تھا نہ صرف دوستی بل کہ زندگی کو سمجھنے کا ایک مشترکہ سفر تھا۔

اور پیپل کا درخت اب بھی وہیں کھڑا تھا، خاموش مگر گواہ۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ کچھ کہانیاں ختم نہیں ہوتیں، وہ صرف انسان کو بدل کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

خالد احمد

دُھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اِک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

سایۂ دار اِدھر، سایۂ دیوار اُدھر
چھاؤں ڈھلتی ہی نہیں جرمِ تن آسانی کی

عشق کاغذ کو بھی دیمک کی طرح چاٹ گیا
خاک چھانے نہ ملی، دھاک سخن دانی کی

صبح سے، شامِ شفق رنگ کا رستہ پوچھا
راہ تکتی رہیں آنکھیں تری طغیانی کی

یہ کرم آپ کیا اہلِ رضا پر، تُو نے
ہمیں زحمت ہی نہ دی سلسلہ جنبانی کی

ہم نے اِس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالدؔ اِس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

غزل

کس کے لیے دنیا من چاہی ہوتی ہے
سب کو کوئی محسوس کمی سی ہوتی ہے

باہر ایک ہی موسم ہوتا ہے لیکن
اندر کی رُت اپنی اپنی ہوتی ہے

جینا سہل بنانے کی خاطر سب نے
کوئی سہانی یاد سنبھالی ہوتی ہے

وقت پڑے تو اک نکتے پر آ جائے
جس کے لہو میں جتنی شکتی ہوتی ہے

برف پہاڑ کے جبروتی سینے سے بھی
دھوپ سے ندیا تو بہنی ہوتی ہے

انساں بھی تو کیا کیا کچھ کر جاتا ہے
ہونی بھی تو آخر ہونی ہوتی ہے

ویسی نظم اک لکھ لینے سے کیا حاصل
جیسی اور کسی نے لکھی ہوتی ہے

عالی اِس سے آگے وہ کیا دیکھ سکیں
جن کی نظر میں دنیا ٹھہری ہوتی ہے

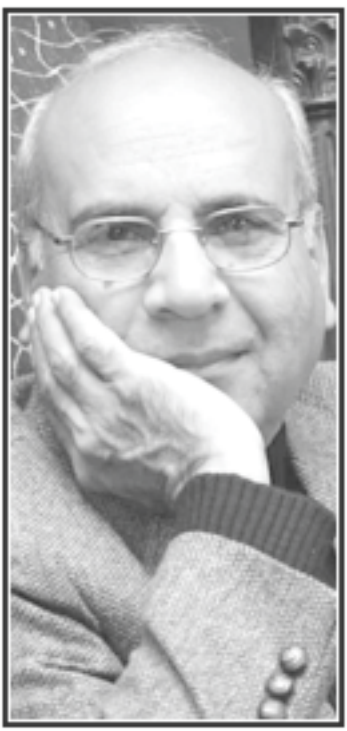

جلیل عالی

غزل

خیال میں اسی خوش خواب کا سویرا ہے
جو میری آنکھ میں ہے دل نشیں، وہ میرا ہے

مرا اثاثہ فن ہے ترے حوالے سے
مرے شعور کا یہ آئینہ بھی تیرا ہے

کہاں ثبات تجھے اے فضائے تیرہ شبی
قدم اٹھیں گے تو پھر ضوفشاں سویرا ہے

ہر اک مقام پہ رکنا اسے گوارا نہیں
ورائے ارض وسما عشق کا بسیرا ہے

کوئی مقام، کوئی کنج عافیت ہو جہاں
کوئی نگر کہ جہاں آشتی کا ڈیرہ ہے

عزیمتوں میں کہیں سے حرارتیں پھوٹیں
کہ ظلمتوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیرا ہے

وفا و مہر کا ہو پاسباں یہ قلبِ حزیں
امیدِ وصل کا پھر ہاتھ میں پھریرا ہے

ریاض، کوئی کرشمہ طلوع صبح ایسا
روش روش ہو چراغاں جہاں اندھیرا ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

بُرا دکھائی نہ دے اور بھلا نظر آئے
ہم ایسے عقل کے اندھوں کو کیا نظر آئے

جنوں کی حد سے گزرنا اسی کو کہتے ہیں
صدا کو دیکھ سکیں اور ہوا نظر آئے

عجیب لوگ ہیں کیسی عجیب خواہش ہے
پسِ نگاہ بھی جو کچھ ہوا نظر آئے

جواز ملتا ہے سجدے سے سر اٹھانے کا
جب ایک ہی میں کوئی دوسرا نظر آئے

سفر تمام نہ ہو بے جہت مسافت کا
ہر انتہاء پہ نئی ابتدا نظر آئے

شبِ سیاہ میں وہ ہم قدم ملے کہ جسے
مری نگاہ میں روشن دیا نظر آئے

اٹھائے پھرتا ہوں چوپٹ کھلی ہوئی آنکھیں
کوئی تو ہو جسے اپنے سوا نظر آئے

زمیں پہ رنگ بکھیرے مہک فضاؤں میں
گلوں کے سر پہ وہ دستِ صبا نظر آئے

کسی سے کام نہیں ہے بس اتنا چاہتا ہوں
جو ایک بار ملا بارہا نظر آئے

وہ خود بھی دے کبھی خالق کو حسنِ خلق کی داد
کہ جب بھی آئینہ دیکھے خدا نظر آئے

نظر تو آتے ہیں جلوے مرے خدا کے کنور
ہم آنکھ ہی نہ اٹھائیں تو کیا نظر آئے

اعجاز کنور راجہ

غزل

سب چنیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ
سر بُریدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

دل کی باتیں سمجھ نہیں سکتے
دل دریدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

مسکرانا تو جانتے ہیں ، مگر
آب دیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

پہلے یہ سر اُٹھا کے چلتے تھے
اب خمیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

صبح پر اُن کو اعتماد نہیں
شب گزیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

دیکھ سکتے نہیں ہیں آئینہ
کور دیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

کر دیا جائے ان کو شہر بدر
بے عقیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

شہر میں اجنبی زیادہ ہیں
چیدہ چیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

میں نے دیکھا ہو خواب میں شاید!
سر کشیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

اپنی اپنی انا کے قاتل ہیں
سر خمیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

جانے کیا بات ہے کہ مجھ سے نسیم
کیوں کبیدہ ہیں میرے شہر کے لوگ

نسیمِ سحر

غزلیں

دل میں تم نے ہے کیا چھپا رکھا
رہن رکھنا پڑا بنامِ وصل

لب پہ جو قفل ہے لگا رکھا
ہجر میں جو بھی تھا کما رکھا

اشک رکھے ہیں دل تجوری میں
کاسہ لیسوں میں بانٹے لعل و گہر

اور ہونٹوں پہ قہقہہ رکھا
اپنے کیسے میں حوصلہ رکھا

عمر بھر صبح کی توقع پر
زندگی بھر وفا نہ کی اُس نے

اِک دِیا طاق میں جلا رکھا
بس ہمیں اپنا مبتلا رکھا

ہاتھ آیا نہ اِک ستارہ بھی
جان و دل دے دیے اُنھیں خاورؔ

پاؤں تو چاند پر بھی جا رکھا
آپ نے اپنے پاس کیا رکھا

خلعتیں دے رکھیں یزیدوں کو
ہمیں مصروفِ کربلا رکھا

خاور اعجاز

ہمارا کِھلنا ، مہکنا سبھی فضول گیا
کتاب خاک میں وہ ہم کو رکھ کے بھول گیا

کسی کسی کو یہاں دیکھا شادماں ورنہ
ہر ایک روتا ہُوا آیا اور ملول گیا

غلط بیانی سے مجھ کو کیا ہے گرویدہ
سو میری بات گئی اور ترا اصول گیا

اُڑا جو رنگ تو خوشبو نے آبرو رکھی
مہک سے عاری ہُوا تو سمجھیے پھول گیا

گنوائی ایک ہی لغزش میں عشق کی پونجی
ذرا سی بات پہ سب حاصل و وصول گیا

غزلیں

دوسرے کی بھی کچھ سُنو ہو تم
یا فقط اپنی ہی کہو ہو تم

کس کی آنکھوں میں ہے قیام، کہو
کون سے دل میں اب رہو ہو تم

رہ دکھاتے ہو رہروؤں کو یا
دو قدم ساتھ بھی چلو ہو تم

کیا غضب ہے کہ سچ بھی بھولو ہو
پھر بھی انجام سے ڈرو ہو تم

توبہ، توبہ، انیسِ جاں، توبہ!
کیسا انصاف ہی کرو ہو تم

محمد انیس انصاری

قحط زدہ نسلوں کے بنجر ہاتھوں کی ریکھاؤں میں
بوڑھا مستقبل بیٹھا ہے حبس آلودہ چھاؤں میں

ابھی تو یہ ننھا سا پودا کتنے ہی دُکھ جھیلے گا
ابھی تو لمحوں کا اک دریا حائل ہے برکھاؤں میں

ہم، کہ اپنے ٹوٹے پھوٹے جسموں کے خوشہ چیں لوگ
لمحہ لمحہ اُتر رہے ہیں عبرت خیز کتھاؤں میں

آوازوں کا شور یکا یک سناٹے میں ڈوب گیا
جانے کیا کیا فیصلے باہم طے پائے میگھاؤں میں

ہم نے اپنے اپنے چہرے زغلِ ذات میں ڈھانپ لیے
تم بھی وہ کہنہ رشتے مت ڈھونڈو اب من بھاؤں میں

غزل

شاعر ہوں قہقہوں کی پٹاری نہیں ہوں میں
کرتب دکھانے والا مداری نہیں ہوں میں

جس کی نظر ہو دولت و شہرت پہ لکھتے وقت
ایسا سخن فروش لکھاری نہیں ہوں میں

گر واقعی ہے میری ضرورت تو بات کر
فارغ برائے وقت گزاری نہیں ہوں میں

حسنِ نظر ہے ایسا اگر سوچتے ہیں آپ
ایسی تو کوئی بادِ بہاری نہیں ہوں میں

کندھے بدل رہے ہیں بہت جلد جلد لوگ
اور یہ بھی کہتے جاتے ہیں بھاری نہیں ہوں میں

تم جس سے مل رہے ہو کوئی اور شخص ہے
اس وقت اپنے آپ پہ طاری نہیں ہوں میں

راحت معاملہ یہ خدا کا ہے اس لیے
سنتا کسی کی منت و زاری نہیں ہوں میں

راحت سرحدی

غزل

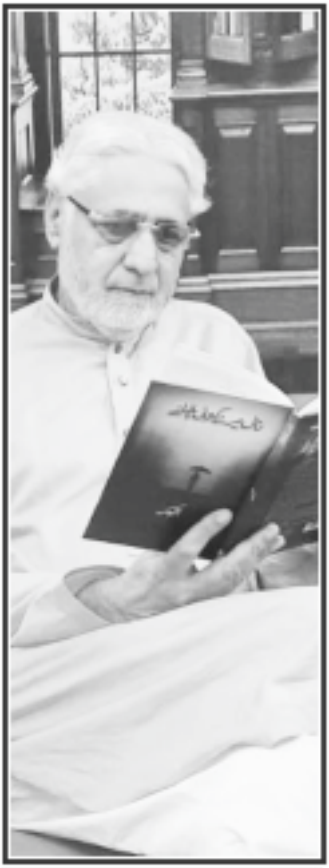

راز چُھپتا نہیں چُھپانے سے
رابطہ کم ہوا بڑھانے سے

قدر کرتا نہیں کوئی ان کی
ہیں مرے خواب کچھ پُرانے سے

تُو سمندر ہے کیا کمی ہو گی
کچھ عطا کر مجھے خزانے سے

جب سماعت جواب دے جائے
کون آتا ہے پھر بُلانے سے

سب کمالات اُس کے ہیں اقبال
کوئی بنتا نہیں بنانے سے

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیازمند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

ڈھلا تھا وصل کی پہلی کرن میں سونا بھی
سجی تھیں رنگ سے آنکھیں بھی اور چہرہ بھی

کِھلی ہوئی تھی وہ انگلی نئی انگوٹھی سے
بندھا ہوا تھا کلائی پہ سرخ گجرا بھی

ستارے اتنے کہ پوروں کو جگمگاتے تھے
دمکتی لَو کی طرح آنکھ میں تھا سُرمہ بھی

ہر ایک رات تھی تعبیر ساتھ ساتھ لیے
ہر ایک سپنے سے آگے تھا ایک سپنا بھی

ہر ایک قوس بدن کی، دھنک بنی ہوئی تھی
کہیں گھٹا سے نکلتا ہُوا تھا چہرہ بھی

وہ کیفِ روح و بدن تھا کہ ایک عمر کے بعد
''پلٹ کے دیکھا تو اڑتی تھی گردِ فردا بھی''

عجیب موسمِ بے اختیار تھا قیوم
کہ پینگ تھا مجھے وارفتگی کا خیمہ بھی

قیوم طاہر

غزل

تیرے خوابوں میں اگر سبز پری آتی ہے
اس کا مطلب ہے تجھے نیند بڑی آتی ہے

آ مرے پاس مجھے ہجر کا پُرسہ دینے
لوگ کہتے ہیں تجھے نوحہ گری آتی ہے

میں جو الفاظ سے تصویر بنا لیتا ہوں
عمر لگتی ہے تو یہ کوزہ گری آتی ہے

سارے لوگوں کے ہی محبوب ہوا کرتے ہیں
سارے لوگوں پہ جوانی کی گھڑی آتی ہے

باتوں باتوں میں ترا ذکر بھی لے آتا ہے
وہ ترا دوست جسے نامہ بری آتی ہے

کس کے پہلو میں مہکتے ہیں تبسم کے گلاب
کس کے حصے میں یہ پھولوں کی لڑی آتی ہے

دل کا کمرہ تری خوشبو سے بھرا رہتا ہے
شام ہوتے ہی تری یاد چلی آتی ہے

دھوپ سہنے سے ہی شاخوں پہ ثمر آتا ہے
ہجر کاٹا ہو تو ملنے کی گھڑی آتی ہے

میں نے لوگوں کو بتایا ہی نہیں نام ترا
میں نے بس اتنا کہا ایک پری آتی ہے

میرے دکھ درد زمانے سے جدا ہیں شاید
لوگ روتے ہیں مگر مجھ کو ہنسی آتی ہے

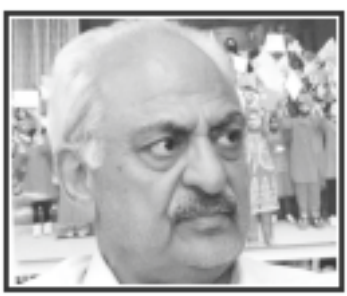

افتخار شاہد

غزل

کیسے رشتوں کی یہاں بے قدری ہوتی ہے
باپ مر جائے تو بیٹوں کو خوشی ہوتی ہے

بھوک کے مارے تڑپتے ہیں شب و روز یہاں
اونچے ایوانوں میں کرسی کی ٹھنی ہوتی ہے

رات کے پچھلے پہر اُٹھ کے کبھی دیکھو تو
بزمِ گل رنگ ستاروں کی سجی ہوتی ہے

گل کھلاتی ہے تو چٹخاتی ہے کلیاں ہر سو
بات جو اُن کے تبسم سے چھنی ہوتی ہے

چند سالوں کی ہے بس بات، رعونت بھی یہاں
منھ رگڑتے ہوئے مٹی میں پڑی ہوتی ہے

ہیں نئی کوٹھیوں میں عیش کے وافر ساماں
ہاں مگر ماؤں کی برکت کی کمی ہوتی ہے

کم ہی انسان رضا پاؤ گے اس جنگل میں
بستیوں میں جہاں آبادی گھنی ہوتی ہے

رضا اللہ حیدر

غزل

شوکت محمود شوکت

ڈرتے نہیں پرندے جو اونچی اڑان سے
عمریں گزار دیتے ہیں وہ آن بان سے

وہ بات پھر نہ پلٹے، جو نکلے زبان سے
واپس نہ آئے تیر، جو نکلے کمان سے

کل کو زمین بوس ہی ہوں گی یہ منزلیں
باتیں جو کر رہی ہیں ابھی آسمان سے

لگتا ہے سارے شہر پہ آسیب کا اثر
باہر کوئی نکلتا نہیں اب مکان سے

بے شک! وہ ہے ہماری رگِ جان کے قریب
لیکن، بہت ہی دور ہے حدِّ گمان سے

شوکت! خلوصِ دل سے دعا مانگتے، اگر
پل بھر میں پھوٹ پڑتے تھے چشمے چٹان سے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آگ تاپی عجب، عمر بھر، بے طلب
جل بجھے، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

غزل

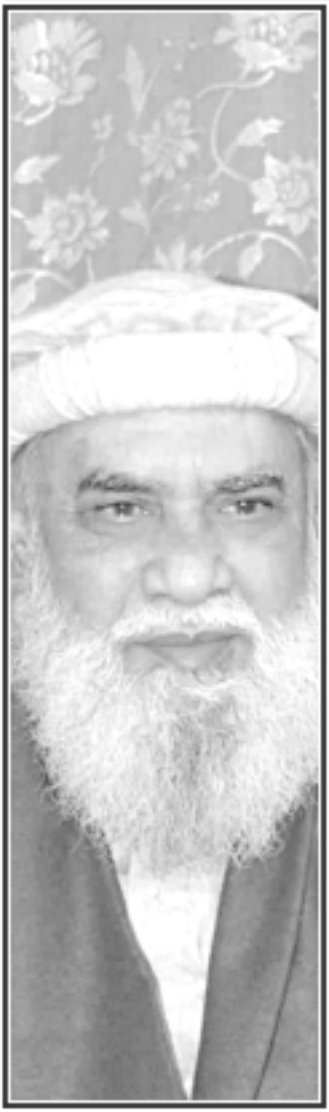

نئے خیال اگاتا نہ میں تو کیا کرتا
غزل کا روپ سجاتا نہ میں تو کیا کرتا

مرے مزاج میں ہی روشنی بکھیرنا ہے
دیا دیے سے جلاتا نہ میں تو کیا کرتا

میں دو بدو کا تھا قائل مرا عدو تھا وہ
جو گر گیا تھا اٹھاتا نہ میں تو کیا کرتا

شکاری ظلم پہ مائل شکار تھا معصوم
ہدف سے اس کو اڑاتا نہ میں تو کیا کرتا

سمجھتا تھا کہ مرے پاس کچھ بچا ہی نہیں
اسے جو ہاتھ دکھاتا نہ میں تو کیا کرتا

مجھے تھا کل تلک اس کی وفا پہ ناز بہت
اگر دیے کو بجھاتا نہ میں تو کیا کرتا

وہ جس کے واسطے لکھی گئی تھی ساری غزل
اسی کو شعر سناتا نہ میں تو کیا کرتا

اکرم ناصر

غزل

یادوں کا اک چاند چمکتا رہتا ہے
سگریٹ، پان کا کھوکھا چلتا رہتا ہے

جانے اسکی آنکھ پسند کرے کس کو
گلشن کا ہر پھول سنورتا رہتا ہے

اشکوں کی برسات میں تیری یادوں کا
ایک دیا آنکھوں میں جلتا رہتا ہے

ملتی ہے کب یوسفِ کنعاں سی قسمت
روز کنوئیں سے کون نکلتا رہتا ہے

اپنے بازو جتنے بھی پھیلاتا ہوں
ہاتھوں میں اک درد سمٹتا رہتا ہے

بھوکی ماں کی چھاتی خالی رہتی ہے
مفلس گود کا چاند بلکتا رہتا ہے

عقیل رحمانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

غزل

چاند ہے سورج ہے بزمِ کہکشاں ہے زندگی
اس زمینِ دل پہ تیرا آسماں ہے زندگی

گونجتی ہے صورتِ نغمہ کہیں تو رات دن
اور کہیں پر صورتِ آہ و فغاں ہے زندگی

آج پھر تنہائیوں کے موڑ پر دل نے کہا
تم جہاں پر ہو ہماری تو وہاں ہے زندگی

ایک دن دیکھا تھا تجھ کو اور اس کے بعد پھر
میں نے یہ دیکھا مری جانب رواں ہے زندگی

جگنوؤں کی روشنی میں عکس دیکھے ہیں ترے
تُو جہاں پر ہے وہیں افروزِ جاں ہے زندگی

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فصل تو نے بوئی تھی، لیکن اسے کاٹیں گے ہم
دیکھ تو حدِّ نظر تک لہلہاتی دوریاں

غزل

اپنی آنکھوں سے کہانی جو سنانی پڑ جائے
میرے دل پر بھی مری آنکھوں کا پانی پڑ جائے

وہ محبت ہی کہاں ہے جو پرانی پڑ جائے
آگ جو دل میں لگی ہے وہ بجھانی پڑ جائے

اپنے موسیٰ کو وہ ہارون عطا کرتا ہے
ایک فرعون کی گردن جو جھکانی پڑ جائے

کیا ستمگر ہیں وہاں سے بھی کما لیتے ہیں
انہیں اجڑی ہوئی بستی جو بسانی پڑ جائے

ایک امکان مری جان نظر میں رکھنا
کیا خبر کس پہ کبھی نقل مکانی پڑ جائے

ہم ہیں خاکی تو بھلا خاک سے بچنا کیسا
خوب اڑائیں گے اگر خاک اڑانی پڑ جائے

اب تو میں سانس بھی لیتے ہوئے ڈر جاتا ہوں
عہد کم ظرف میں قیمت نہ چکانی پڑ جائے

اک زمانہ تھا کوئی بات نہیں بھولتی تھی
اب کوئی یاد نہیں ہے کہ بھلانی پڑ جائے

یوں نہ ہو چاند نکل آئے کہیں عید کے بعد
وقت بے وقت ہی اک عید منانی پڑ جائے

سعد سر بار ہوا کرتا ہے پھر شانوں پر
جب کبھی عزت سادات بچانی پڑ جائے

سعد اللہ شاہ

غزل

رہا کرتے نہیں، پنجرہ فقط تبدیل کرتے ہیں
وہ قید و بند کی یوں بھی نئی تشکیل کرتے ہیں

کھڑے ہوتے نہیں ہیں اپنی پوری قامت و قد سے
جھکائے سر کو جو ہر اذن کی تعمیل کرتے ہیں

یہ پیاسے ہو کے بھی، اوپر فضا میں اڑتے رہتے ہیں
پرندے آب جو کی اس طرح تذلیل کرتے ہیں

سمندر ان کی آنکھوں میں سمٹ کر قطرہ بنتا ہے
کچھ ایسے بھی ہیں جو آغوش کو زنبیل کرتے ہیں

کھلے رکھتے ہیں دروازے، سگِ آوارہ کی خاطر
ہوا داخل نہ ہو، یوں کھڑکیاں وہ سیل کرتے ہیں

مری خوشیوں کے بدلے میں، تم "اپنے دکھ مجھے دے دو"
ہمارے عہد کے بیدی کہاں اب ڈیل کرتے ہیں

ہمارے دست و بازو ایک ایسے فن سے ہیں واقف
بہاؤ روک کر، دریا کو غافر جھیل کرتے ہیں

غافر شہزاد

غزلیں

پھر اسی زخم پر اور محنت کروں گا
میں نے سوچا تھا تجھ سے محبت کروں گا

جانے والے ٹھہر سارے آنسو بہا لوں
میں کھلی آنکھ سے تجھ کو رخصت کروں گا

سبز پانی ہے تالاب کا، گھاس پیلی
ہنس اور تتلیوں کو روایت کروں گا

فیصلہ کر چکا ہوں میں حق میں ترے اور
مطمئن ہوں کہ اپنی حمایت کروں گا

تجھ سے کچھ بھی نہ میں کہہ سکوں گا مگر پھر
عمر بھر شاعری میں وضاحت کروں گا

آندھیوں میں یہ سوکھا ہوا حوصلہ بھی
ٹوٹ ہی جائے گا لاکھ ہمت کروں گا

آخری خواب ہے پتلیوں کے نگر کا
میں انیم اس کو آنکھوں کی تربت کروں گا

ابو طالب انیم

اشک کی گود میں پالے ہی نہیں جاتے ہیں
مجھ سے رشتے، کہ سنبھالے ہی نہیں جاتے ہیں
چاہتا ہوں کہ یہ سب نقش حقیقت چھپ جائیں
میرے خوابوں سے اجالے ہی نہیں جاتے ہیں
بے زری خیر جو تھی، تھی! مری قسمت میں مگر
وہ گدا گر ہیں جو ٹالے ہی نہیں جاتے ہیں
کس بھروسے پہ میں اس فرشِ وفا پر کھیلوں
ریت کے گیند اچھالے ہی نہیں جاتے ہیں
میں نے سوچا تھا ترا نام ہتھیلی پہ لکھوں
میری ریکھاؤں سے چھالے ہی نہیں جاتے ہیں

شعر تو کیا ہیں فقط شورِ مسلسل ہیں جو پھر
لفظ کی شکل میں ڈھالے ہی نہیں جاتے ہیں
دستِ آدم نے بھلے تارِ قفس توڑ دیے
ذہنِ انسان سے تالے ہی نہیں جاتے ہیں
نت نئے گھونسلے ہر روز بناتا ہوں انیم
پھر بھی یہ چھت ہے، کہ جالے ہی نہیں جاتے ہیں

غزل

تو مرے ساتھ ہے اور وقت گزرتا ہی نہیں
یہ وہ مفہوم ہے جو لفظ میں ڈھلتا ہی نہیں

میں نے چاہا تھا کہ تحریر کروں سب آنسو
کیا کروں درد یہ، کاغذ پہ اترتا ہی نہیں

وقت کہتا ہے رکو دل نہیں رکنے دیتا
یہ وہ دریا ہے جو ساحل پہ ٹھہرتا ہی نہیں

چاند بھی تجھ سے منور ہے ستارے بھی ترے
تیرا جلوہ کسی منظر سے نکلتا ہی نہیں

وصل میں بھی ہے عجب ہجر کا عالم دل پر
ایک ٹوٹا ہوا رشتہ ہے جو جڑتا ہی نہیں

وقت تو خیر گزر جاتا ہے لیکن عابد
ہائے یہ لمحہ موجود کہ مرتا ہی نہیں

عابد خان عابد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکل شکل زندانی، سحرِ بے رُخی کی ہے
آرزوؤں کی بستی میں، دھوم سامری کی ہے

غزلیں

تمہارے ہاتھ میں رسّی بہت تھی
مگر دُکھ کی ندی گہری بہت تھی

وہ ڈر کے بارہا ہٹتا تھا پیچھے
مدد ڈوبے سے مانگی بہت تھی

بنا کے گھر پھر ان کو توڑ ڈالا
کنارے جھیل کے مٹی بہت تھی

بچھڑنے سے ترے سب کچھ وہی تھا
رگِ جاں ہر گھڑی دُکھتی بہت تھی

پسِ دیوار بھی رستہ تھا مشکل
مگر دیوار کچھ اونچی بہت تھی

اسے حالات نے قابو کیا تھا
وہ اِن حالات میں راضی بہت تھی

میں جب بازار سے لوٹی تو سوچا
وہاں ہر چیز ہی مہنگی بہت تھی

رخشندہ نوید

میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں تو پھر تعمیر ہوتی ہوں
کبھی جب خواب بُنتی ہُوں تو پھر تعبیر ہوتی ہوں

مرا عکاس کیسی کیسی تصویریں دکھاتا ہے
ہر اِک تصویر میں حیرت زدہ تصویر ہوتی ہوں

محبت میری لہروں سے سنبھالی ہی نہیں جاتی
ترا خالی سمندر دیکھ کر دل گیر ہوتی ہوں

سُدھا لینا مجھے اس عمر میں اک کار مشکل ہے
نہیں میں زر خرید ان کی نہ میں جاگیر ہوتی ہوں

اٹھاؤں کون سی دیوار پر رشتوں کی دیواریں
نہیں تو کوہکن اور نہ میں جوئے شیر ہوتی ہوں

غزلیں

یاد کے غار میں اترا تو خزانے نکلے
سچ کی آغوش سے خوابیدہ فسانے نکلے

جانے کس آنکھ سے دنیا کو ابھی دیکھا ہے
کن مقامات پہ کس کس کے ٹھکانے نکلے

رونقِ عقل و خرد کے سبھی خفیہ منظر
میری رنگینیِ وحشت کو سجانے نکلے

وصل کی رُت کے عزائم کو مٹانے کیلئے
موسمِ ہجر کے لشکر سے بہانے نکلے

اس کو ظلمت کے سیہ ناگ نگل ہی جاتے
حرمتِ شب کو مگر خواب بچانے نکلے

افتخار الحق

فصیلِ جاں کیا دھر آئینہ بناتا ہوں
اک اور عکس بدن سے درا بناتا ہوں
چُرا کے وقت کے ٹکڑے بڑی مہارت سے
کبھی خیال کبھی تجربہ بناتا ہوں
وہ جس کی لو میں کئی خواب جھلملاتے ہیں
میں بند آنکھ میں ایسا دیا بناتا ہوں
عجب طلب ہے کہ رہ جاؤں لوحِ دنیا پر
سو اپنے آپ کو اک واقعہ بناتا ہوں
درونِ شہر بھی جانا بہت ضروری ہے
حصارِ ذات میں کچھ راستہ بناتا ہوں

شجر امید کا پھل اور دینے لگتا ہے
میں شاخ توڑ کے جب وسوسہ بناتا ہوں
بہت عزیز ہے یہ خامۂ دعا مجھ کو
میں اس سے روز نیا زائچہ بناتا ہوں
نظر کہے گی کہ آواز میں دکھاؤں اسے
سماعتوں کو اگر ذائقہ بناتا ہوں

غزل

طلعت شبیر

ہر پَل وہ میری ایسی ضرورت ہے آج بھی
اِک شخص میری روح کی راحت ہے آج بھی

خوشبو ستم ظریف کی بکھری ہے چار سُو
میرے نگر میں اُس کی حکومت ہے آج بھی

گو وقت کا غبار بھی جُھریوں میں ڈھل چکا
لیکن دہائیوں کی رفاقت ہے آج بھی

اُس کے بنا تو کوئی بھی بھایا نہیں ہمیں
ہم کو اُسی جمال کی عادت ہے آج بھی

صحراؤں کے سفر میں وہ سایہ فگن رہا
مجھ پر تو اُس کی ایسی عنایت ہے آج بھی

ترکِ تعلقات پہ وہ خواب ہو گیا
جو میری زندگی کی حقیقت ہے آج بھی

مٹی سے میرا پیار کا رشتہ قدیم ہے
مٹی سے میرے پیار میں شدت ہے آج بھی

غزل

غم کے کبوتر نے جانے کس سمت کی اُڑان تھی
دل کی منڈیر پہ دانہ دانہ خواہش بکھری تھی

خوشبو، پھول، ہوا اور پنچھی، ہر کوئی ساکت تھا
اب کے باغ میں پتھر کی اک بنچ مہکتی تھی

شام کے سائے دل میں اُتر آئے تو دھیان آیا
کس نے میری سانسوں میں دیوار اُٹھائی تھی

میرے دل میں گرتھی نکہت اُس کی یادوں کی
اُس کے گھر بھی میرے خط کی خوشبو پھیلی تھی

دل سے پھوٹ رہی ہو جیسے مصرع مصرع نظم
یوں میرے وجدان میں کھلتی آہٹ کس کی تھی

اندر کا سناٹا بھانپ کے لوٹ گئی ہو گی
اُس کی محبت میرے دروازے تک آئی تھی

ان لکھے لفظوں کے معانی میرے جیسے تھے
ان دیکھے موسم کی خوشبو تیرے جیسی تھی

جانے کیسے یک دم گھور اندھیرا پھیل گیا
میں نے بھی دن کی گلی تک جاتے شام تو دیکھی تھی

سب سے مل جل کر بھی وہ ملتا جلتا کم تھا
اُس کی بس یہ عادت مجھ سے ملتی جلتی تھی

حامد یزدانی

غزل

اعجاز روشن

دیئے کی آخری ہچکی اگر ہو اُسن لے
تو کیا عجب کہ مری التجا خدا سُن لے

ہے فہمِ ذات مقدم، حصولِ منزل سے
یقیں نہ ہو تو صدائے نقوشِ پا سُن لے

رہی نہیں مجھے حاجت بیان درد کروں
یہ بات کاش مرا درد آشنا سُن لے

نئے پرانے سخن کو وہی سمجھتا ہے
خموشیوں سے جو الجھی ہوئی صدا سن لے

گئے وہ وقت کہ باتیں چھپائی جاتی تھیں
مگر ہے اب یہی کوشش کہ دوسرا سُن لے

میں کیفیت میں دعا مانگنے سے ڈرتا ہوں
نجانے کیا میں کہوں، وہ نجانے کیا سُن لے

خبر تو لیں کوئی روشن، وہ بے وفا ہی سہی
مبادا فیصلہ دل کا مری انا سُن لے

غزل

جس نے دیکھا بھی نہیں، اس کا تمنائی ہے
دل مرا دل نہیں، اس ایک کا سودائی ہے

عشق میں، میں نے ملاقات نہیں لکھوائی
ہو ملاقات، سراسر یہی رسوائی ہے

پُرسکوں رہتا ہے جب یاد سے دل خالی ہو
جب دھڑکتا ہے تو لگتا ہے کہ یاد آئی ہے

ہر بلا سے رہے محفوظ وہ اللہ کرے
آج بے وجہ طبیعت مری گھبرائی ہے

خوف ناکامیء الفت سے سراسیمہ ہے
کھلنے سے پہلے کلی دل کی یہ مرجھائی ہے

سُندئ باد میں ہیں آج جنوں کے آثار
دیپ جلتے کئی گھر کے یہ بُجھا آئی ہے

ہم سے بھی ربط میں رہتا ہے رقیبوں سے بھی
کس کا محبوب نظر، کس کا یہ سودائی ہے

اجمل اعجاز

غزل

محمد افضال انجم

کیسے ہم بچھڑے تھے کب یاد نہیں
کب لگی دل میں نقب یاد نہیں

ایک دھندلا سا خیال آتا ہے
اب کوئی بزم طرب یاد نہیں

پہنچے کس طرح سے اس حال کو ہم
ڈھایا کس کس نے غضب یاد نہیں

ہاتھ اپنا تھا کبھی دست عطا
کب بنا دست طلب یاد نہیں

رونق بزم جہاں بھول گئی
کیا ہوا اس کا سبب یاد نہیں

تیرے غم نے بھلا دیا سب کچھ
کیوں رہے جان بہ لب یاد نہیں

ہم رہے جن میں کبھی ساتھ انجم
دن وہ اور عرصۂ شب یاد نہیں

غزل

چہرے پر زردیِ رُخسار تو رکھنے سے رہے
عشق میں میر سا معیار تو رکھنے سے رہے

اُس نے بھجوائے ہیں جو پھول وہی رکھیں گے
میز پر شام کا اخبار تو رکھنے سے رہے

تجھ سے اب ٹھن ہی گئی ہے تو ٹھنی رہنے دے
ہم ترے پاؤں میں دستار تو رکھنے سے رہے

دل پسیجا نہ کسی درد پہ آنسو نکلے
خواہشِ لذتِ آزار تو رکھنے سے رہے

چاک دامان و تہی جیب جو ہم جیسے ہیں
عزتِ گرمیِ بازار تو رکھنے سے رہے

جانے دے اُس کی تمنا بھی اگر جاتی ہے
دل میں ہم خواہشِ بے کار رکھنے سے رہے

کیوں نہ میدان میں زیتون کی ٹہنی لے جائیں
خود کو ہم برسرِ پیکار تو رکھنے سے رہے

روزِ اول سے جو کردار ہے اِس دنیا کا
ہم کہانی میں وہ کردار تو رکھنے سے رہے

رہ زنوں سے ہے بہت گہرا تعلق اُن کا
ہم اُنھیں قافلہ سالار تو رکھنے سے رہے

نبیل احمد نبیل

غزل

فیض رسول فیضان

گیت گاتے تھے جو کل امن و محبت والے
بن گئے آج وہی لوگ ہلاکت والے

چار جانب سے جسے گھیر لیا جاتا ہے
اُس پہ آثار اُتر آتے ہیں قدرت والے

یہی تاریخِ زمانہ سے سبق ملتا ہے
ہار جاتے ہیں بالآخر سبھی طاقت والے

ہونے ہی والا ہے فرعون ذلیل و رُسوا
باب کُھلنے کو ہیں اللہ کی رحمت والے

شر کے اندر سے نکل آتی ہے خیر و برکت
دیکھتے جاؤ نظارے یہ مشیّت والے

رُوحِ اقبالؒ ہے قائدؒ سے بہت شرمندہ
مل گئے خاک میں سب خواب اخوت والے

گُنبدِ سبز ہمیں پوچھ رہا ہے فیضان
کیا یہی چال چلن ہوتے ہیں اُمّت والے

غزل

آرزو کیجیے زخموں کا مداوا کوئی اور
دیکھیے خون کی برسات میں بھیگا کوئی اور

خاک کی سمت سفر اتنا بھی دشوار نہیں
میں نے دشمن کو لگا تار پکارا کوئی اور

کر چکا روزِ مشقت کا بھی دریا میں عبور
کب مقدر ہوا راحت کا ستارا کوئی اور

بٹ چکا میں کہ چمکتا ہوا گوہر تھا کبھی
ابھی کٹ جائے نہ مرجان خدارا کوئی اور

آخری خط میں کہا تھا مجھے قاتل جس نے
قتل کرنے کو مجھے آیا اُسی سا کوئی اور

میرا سردار بھی دشمن کا سپاہی تھا مگر
ہوگیا تیر مرے سینے میں ترچھا کوئی اور

میں سدا اِس کا طرف دار رہوں یار رہوں
دل یہ رکھتا ہے کہاں مجھ سے علاقہ کوئی اور

غم مناتا ہوں شبِ غم بھی مناؤں گا سدا
جھلملائے مری تنہائی میں چہرا کوئی اور

اضطراب اپنا سوا ہوگیا عادل جو ابھی
میرے اندر پڑا سناٹا پکارا کوئی اور

عزیز عادل

غزل

ملے ہیں دوست ذرا کم ، مُنافقین بہت
جلیں گے اپنے حَسد میں، یہ حاسدین بہت

تم اپنے حُسن کے جلوؤں سے داد لیتی رہو
ہمارے شعر کی بندش کے سامعین بہت

سُنا رہا ہوں کلام اپنا بند کمرے میں
ہیں انتظار میں باہر بھی شائقین بہت

ہوئے بیان مہمیز خوب میر و غالب کے
ملیں گے میری غزل کے بھی شارحین بہت

بہت ہی کم ہیں خریدار گرچہ کاغذ کے
اگر چھپیں کی کتابیں تو قارئین بہت

کسی کو لفظ و معانی سے آشنائی نہیں
دکھائی دیں گے تجھے پھر بھی ناقدین بہت

عجب طرح کی عداوت نے سر اُٹھایا ہے
یہ جنگ ایک ہے لیکن ہیں فاتحین بہت

ہم اُس کی بزم سے چُپ چاپ اُٹھ جو آئے ہیں
سو ایسی بات پہ حیراں میں حاضرین بہت

نجانے کون سا جادُو ہے اُس کے لفظوں میں
کہ آفتاب کو مِلتی ہے آفرین بہت

آفتاب خان

غزل

نہ پھٹکارے نہ ہی ڈانٹے گئے ہیں
ادب سے بے ادب چھانٹے گئے ہیں

گلوں سے دست برداری تو کی ہے
نکل سب راہ کے کانٹے گئے ہیں

منافع دے کے گھاٹا رکھ لیا ہے
اثاثے اس طرح بانٹے گئے ہیں

ہمیں راس آ گئی ہے اب جدائی
تبھی سہ وقت کے چانٹے گئے ہیں

تعصب، شر پسندی، بے اصولی
جو اُن کے پاس تھا بانٹے گئے ہیں

لگا کر آگ خود خرمن کو عاجزؔ
ہواؤں کو وہ پھر ڈانٹے گئے ہیں

نوید عاجز

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

تن آج جلایا ہے، کل راکھ اُڑا دیں گے
وہ نام کو دو دن میں، دشنام بنا دیں گے

غزل

نہیں شکوہ، تو ترے لہجہ و گفتار کے ساتھ
بس پریشاں ہوں تجھے دیکھ کے اغیار کے ساتھ

کوئی مسکن نہ ٹھکانہ ہے نہ منزل کا سراغ
میں تو وہ قوس ہوں بنتی ہے جو پُرکار کے ساتھ

لذتِ مے سے شناسا وہ نہیں ہو سکتا
جو نہ رکھتا ہو تعلق کسی میخوار کے ساتھ

تم تو خیموں کو ہٹا لو ذرا ساحل سے پرے
میں نے لڑنا ہے ابھی ظلم کی منجدھار کے ساتھ

دیکھ کر میری طرف بات کرو تو سمجھوں
بات کھلتی ہے تری آنکھ کے اظہار کے ساتھ

بھول جاؤ گے مسائل کے سبھی الجھاؤ
گر الجھ بیٹھے کسی گیسوئے خمدار کے ساتھ

تم کسی طرح نہیں مجھ کو مٹا پاؤ گے
فن تو مرتا نہیں فنکار کا فنکار کے ساتھ

مڑ کے دیکھو گے تو رستہ ہی گنوا بیٹھو گے
اس لیے چلتے رہو وقت کی رفتار کے ساتھ

وہ تو پھولوں کی رفاقت میں بھی ٹوٹا نہ کبھی
رابطہ جو تھا مرا وادیِ پُر خار کے ساتھ

سرور فرحان

غزل

وہ راستے سے ہٹا گیا تھا
دیے بھی سارے بُجھا گیا تھا

صبا کی مٹھی میں وہ تو شاید
تمام موسم تھما گیا تھا

جو وقت گزرا اداسیوں میں
وہ جانے کیا کیا سکھا گیا تھا

عجیب تھا وہ بھی داستاں گو
کہ جھوٹے قصے سُنا گیا تھا

کوئی تو آنکھیں مِری بھی دیکھے
نمی وہ جن میں بڑھا گیا تھا

وہ پھول جانے کِھلیں گے کب تک
جو کاغذوں پر بنا گیا تھا

میں ڈھونڈتا بھی اُسے کہاں تک
وہ نقشِ پا بھی مٹا گیا تھا

بچھڑ کے ہم سے وہ بے وفا تو
غموں کی بستی بسا گیا تھا

جواب خود بھی نہ دے سکا تھا
سوال ایسے اُٹھا گیا تھا

جو العطش کی صدا لگائی
کہ تیر تشنہ ہی آ گیا تھا

اِدھر وہ آ کے چلا گیا تھا
تو پھر نہ مجھ سے رہا گیا تھا

وہاں کا سوچو جہاں ہے جانا
جو راز احمد بتا گیا تھا

علی رضا احمد

غزل

ختم ہوتی ہی نہیں اپنی پریشانی میاں
جون بھی یہ کہتے کہتے چل دیئے جانی میاں

معتقد ہوں میر کا غالب سے ہوں میں فیض یاب
اس لیے بھی چلتی رہتی ہے غزل خوانی میاں

شاعری بھی چل رہی ہے چل رہا ہے عشق بھی
دوستوں کو ہو رہی ہے اس پہ حیرانی میاں

اک مشقت کے سفر سے لوٹتے ہیں روز ہم
ایسے تو ہوتی نہیں ہے دنیا دیوانی میاں

میں سمجھتا ہوں کہ اس پر اتنا حق تو ہے مرا
چوم لوں گا ایک دن میں اس کی پیشانی میاں

میں بھی مجنوں کی طرح صحرانوردی جا کروں
یوں تو مجھ کو بھی میسر ہے یہ آسانی میاں

پیچھے مڑکر دیکھنا آتا نہیں دانش ہمیں
فیصلوں پر ہم نہیں کرتے نظر ثانی میاں

اعجاز دانش

غزل

مت ربط بڑھا تو ہر کسی سے
وقت اپنا گزار خامشی سے

بہتر ہے الگ تھلگ رہے وہ
ملتا جو نہیں ہے ہر کسی سے

مطلب کا ہے یار خود غرض ہے
آزردہ ہے جو مری خوشی سے

اُس کو جو اسیر ہے جہاں کا
مطلب نہیں میری دوستی سے

دنیا کا مزاج آشنا تھا
کل مجھ کو ملا جو بے بسی سے

اک یاد سے منسلک رہی جو
گزرا تھا میں کل اسی گلی سے

ہنستے ہوئے سر پہ چڑھ گیا ہے
جس کو بھی ملے ہیں عاجزی سے

دنیا سے امام کٹ گیا ہوں
دل بھر سا گیا ہے زندگی سے

مظہر امام

غزلیں

انجمن ہائے رنگ و بُو فانی
چار دن کے لیے ہیں نظارے
میں بھی فانی ہوں اور تُو فانی
قریہ قریہ ہے ، گو بہ گو فانی

زندگانی کی ہاؤ ہو فانی
شکر صد شکر کچھ نہیں دائم
یہ حسیں رات ، آب جُو فانی
ظلم تیرا ، جفا کی خُو فانی

یہ ملاقاتِ روبرو فانی
کتنے نامی جہان سے گزرے
تیری میری یہ گفتگو فانی
غالبؔ و میرؔ ، آرزوؔ ، فانی

ایک ہم پر ہی تو نہیں موقوف
جلوۂ زیست چارسُو فانی

خالدہ انور

میری قسمت ہے شہرِ تنہائی
راس آیا ہے زہرِ تنہائی

بھری دنیا ہے دہرِ تنہائی
زندگی اس میں ڈوب جاتی ہے
کچھ تو سامان بہرِ تنہائی
اتنی گہری ہے نہرِ تنہائی

مجھ کو اِک روز بھسم کر دیں گے
ہجر کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں
شبِ خاموش ، قہرِ تنہائی
شامِ تنہائی ، سحرِ تنہائی

اُس نے لکھا نکاح نامے پر
تیری یادوں کا بادبان کُھلا
نان و نفقہ و مہرِ تنہائی
پار کرلیں گے بحرِ تنہائی

غزل

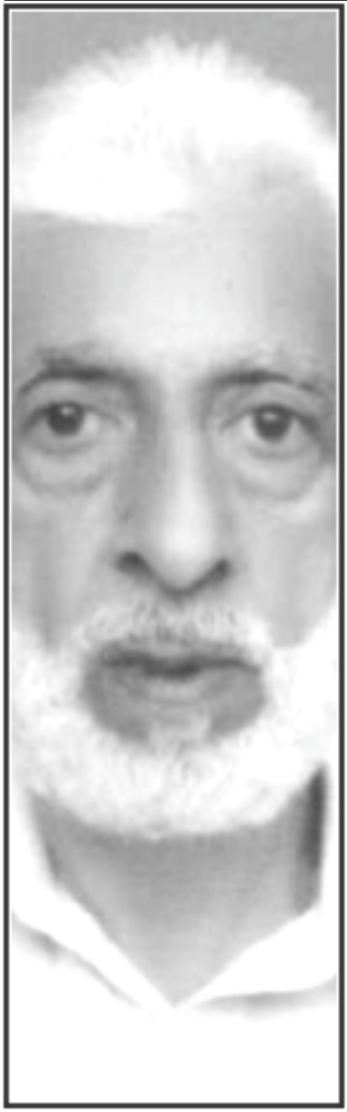

جب کبھی کوچے میں تیرے جانِ من پہنچی سحر
جس طرح جوبن ہے تیرا اس طرح نکھری سحر

بدنصیبی ہے یہ میری یا کرشمہ ہجر کا
دیکھتی ہیں میری آنکھیں دُھند میں لپٹی سحر

جس نگر میں سب کے سب تھے تیرہ بختی کے اسیر
اُس نگر میں تم بتاؤ کس طرح جاتی سحر

کیوں نہ ہوگا لمحہ لمحہ اس کا صدیوں پر محیط
ہے ہماری عمر میں یہ ہجر کی پہلی سحر

سیلی سیلی سی نہیں ہے بے سبب یہ دوستو
میرے اشکوں کی نمی سے رات بھر بھیگی سحر

جو لکھا کاتب نے دونوں کو وہی کچھ مل گیا
ہے سحر تیری جدا اور ہے جدا میری سحر

چلتی چلتی آ گئی پھر تیرگی کے دیس میں
بے وفا اُس کی طرح شاہد کہاں ٹھہری سحر

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

میتھیو محسن

ایک تو ہی مہرباں نہ رہا
پھر کہیں پیار کا نشاں نہ رہا

جو عطا کی ترے تصور نے
اُن بہاروں کا بھی سماں نہ رہا

کھل گیا عشق میں فریب خرد
آگہی کا کوئی نشاں نہ رہا

شوقِ منزل نے بے قیام رکھا
دل کا گو حوصلہ جواں نہ رہا

جب درِ دوست پر جھکا محسن
دشمن اس کا پھر آسماں نہ رہا

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اک اک بات تمھیں بتلا دی اب آگے تم جانو
وہ بھی جواب نہیں دیتے، تم بھی سوال نہ کرنا

غزل

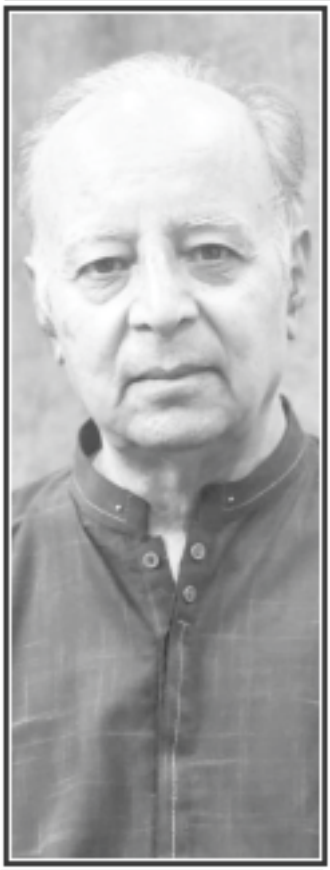

سمیع اللہ عرفی

خیال میں جو قید تھا وہ دھیان سے نکل گیا
مرے غرور سے وہ میرے مان سے نکل گیا

وہ سانس تھا کہ روح تھی یہ فیصلہ نہ ہو سکا
جو جسم سے نکل گیا جو جان سے نکل گیا

میں بھید اپنی ذات کے، قریب تھا کہ کھول دوں
ریاضتوں کے درمیاں وہ گیان سے نکل گیا

میں اس کے بھاؤ تاؤ میں الجھ گیا تھا اسقدر
وہ اپنا آپ بیچ کر دکان سے نکل گیا

عجیب شخص تھا وہ دشمنوں کے عرفی روپ میں
جو دھوپ لے کے میرے سائبان سے نکل گیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکر گزار عطا رہنا یہ عجز انہی کی عطا ہے
عجز میں رنگِ کمال بھریں تو غرورِ کمال نہ کرنا

غزل

کھڑا ہے لمحے کی ڈوری پہ سارا مستقبل
ہمارے ہاتھ میں کب ہے ہمارا مستقبل

اِسی زمین سے ہم سبزہ بن کے پھوٹیں گے
یہی زمین ہے میرا تمھارا مستقبل

بس ایک یاد پہ بنیاد حال کی رکھی
اور ایک خواب پہ ہم نے اُسارا مستقبل

خدا نے رکھ لیا پردہ ہمارے فردا کا
کہ آج تک نہ کیا آشکارا مستقبل

ہمیں بھی ساتھ ہی پل پل گھمائے رکھتا ہے
غبارِ غیب کی گردش کا مارا مستقبل

خود اپنے خواب کے مضمون آفرین ہیں ہم
ہماری نظم کا ہے استعارہ مستقبل

نجومیوں نے ہمیں جس قدر بتایا تھا
نہیں تھا اتنا بھی روشن ہمارا مستقبل

عجیب وقت میں عنقا کا خواب دیکھا ہے
عجیب حال میں ہم نے گزارا مستقبل

بنا بنایا ملا ہے بہشت میں آ کر
نہیں بنانا پڑا ہے دوبارہ مستقبل

شاہد ماکلی

غزل

زردیٔ شام آبدیدہ
عشقِ ناکام آبدیدہ

ٹوکرے مچھلیوں کے دریا
کر کے نیلام آبدیدہ

بند میخانۂ محبت
دل تہہِ جام آبدیدہ

پھر چھپاتے پھریں کبوتر
کوئی پیغام آبدیدہ

سُرخ آندھی چڑھی ہوئی ہے
بتکدہ رام آبدیدہ

آنکھ سے گرتا آبِ زم زم
جیبِ احرام آبدیدہ

سائنسی سُرخیوں کے آگے
سیلِ اوہام آبدیدہ

ہتھ کڑی پر جمائے نظریں
اک سیہ فام آبدیدہ

تنویر قاضی

غزل

حق گوئی چھوڑ؛ محوِ خرافات ہو گئے
عالی نسب تھے ہائے وہ کم ذات ہو گئے

ٹوٹا ہے قہر شہر کے باسی بکھر گئے
جو رہ گئے وہ بکھرے ہوئے پات ہو گئے

شمعِ حرم تھے زینت محرابِ آگہی
کعبے گئے تو شاملِ جمرات ہو گئے

اب ہو گیا ہے شہر میں کٹھ پتلیوں کا راج
اب کاسہ لیس اہلِ کرامات ہو گئے

کم ظرف تھے چھپا نہ سکے بے بضاعتی
ہائے وہ لوگ مظہرِ اوقات ہو گئے

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رُت چال چلیں گے بھی تو گُل بار چلیں گے
ہم وقت ہیں ، ہم وقت کی رفتار چلیں گے

غزل

بستی ہماری جس کے تلاطم کی زد میں ہے
وہ بھی یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی حد میں ہے

اس عدل کے فریب سے یارب ہمیں بچا
دنیا جہاں کا ظلم روا جس کی مد میں ہے

میں اس لیے بھی چپ ہوں عدالت کے روبرو
ہر اک دلیل میری مرے اپنے رد میں ہے

ہے کوئی جس کو دنیا میں اپنی ملی جگہ ؟
مٹی یہاں کسی کی ، کسی کی لحد میں ہے

کیا کہیے اس سے کیا ہے خداؤں کو مسئلہ
اک پیڑ جو ازل سے ہواؤں کی زد میں ہے

لے آیا ہوں میں گرمیء بازار دیکھ کر
اس بار ایک خواب بھی میری رسد میں ہے

مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں ترے شہر کے مکیں
جانے شبیہ کس کی مرے خال و خد میں ہے

علمدار حسین

غزل

بات کرتی ہے صراحی کہ سبو بولتا ہے
بُلبلیں کیف میں سُنتی ہیں جو تُو بولتا ہے

جب رعونت سے مرے ساتھ عدو بولتا ہے
انتقاماً اُسی لہجے میں لہو بولتا ہے

مکتبِ عشق میں تہذیب ہُوئی ہے میری
سو میں خاموش ہُوں دامن کا رفو بولتا ہے

کتنی صدیوں میں یہ لہجوں کی کھنک بنتی ہے
میں نہیں بولتا پُرکھوں کا لہو بولتا ہے

روز اک یاد گرا جاتی ہے پتھر دل میں
روز طائر کوئی آ کر لبِ جُو بولتا ہے

سچ فقط بولنا کافی نہیں سُنتا بھی ہے
روبرو آ کے کوئی آئنہ رُو بولتا ہے

میرے انفاس سے آوازِ درود آتی ہے
میرے احساس میں اک نغمۂ ہُو بولتا ہے

تیرے اشعار میں شوریدہ سری ہے ساگر
کون اندر سے میانِ من و تُو بولتا ہے

دل کی مسجد میں غمِ ہجر اذاں دے تو سلیم
شورِ گریہ کی طرح آبِ وضو بولتا ہے

محمد سلیم ساگر

غزل

اُونچی دیواریں اٹھاؤ مرے چاروں طرف
اک نیا شہر بساؤ مرے چاروں طرف

میری آواز الگ سب کو سنائی دے گی
جتنا بھی شور مچاؤ مرے چاروں طرف

ڈوبے جاتے ہیں اندھیرے میں اجالے کے نقوش
دوستو! آگ لگاؤ مرے چاروں طرف

پھر سمجھ آئے گی تنہائی کسے کہتے ہیں
سیر کرنے کبھی آؤ مرے چاروں طرف

اجنبی لوگوں کی آوازوں سے ڈرنے لگا ہوں
میری آواز سناؤ مرے چاروں طرف

اک نئے ڈھنگ سے ممکن ہے کہ ہو جاؤں ظہور
اِس قدر خاک اُڑاؤ مرے چاروں طرف

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس ، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

غزل

اگرچہ ہر طرح مجبور ہیں ہم
مگر اے ہمنشیں! مسرور ہیں ہم

نجانے آنکھ کیوں رہتی ہے پُرنم
نجانے کس لئے رنجور ہیں ہم

خیال دوست ہے اب اور ہم ہیں
جہان رنگ و بُو سے دور ہیں ہم

مئے دنیا کی کیا ہم کو ضرورت
نگاہوں سے تری مسرور ہیں ہم

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ذکر بہاراں
گُلستاں سے تو کوسوں دور ہیں ہم

انوار انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ہم کو اُٹھائیں گے، سینے سے لگانے کو
پلکوں پہ بٹھا کر جو، نظروں سے گرا دیں گے

غزل

تم بلاؤ تو سر کے وہ بل آئے گا
اپنی تصویر سے بھی نکل آئے گا

وہ بڑھائے گا پہلے پریشانیاں
پھر اچانک ہی لے کے وہ حل آئے گا

بیٹھ جائے گا آ کے وہ قدموں میں یوں
تم پگھل جاؤ گے ایسا پل آئے گا

رائیگانی کا خدشہ نہیں عشق میں
آج آئے نہ آئے وہ کل آئے گا

بارشیں وصل والی برسنے تو دو
سات رنگوں میں یک دم وہ ڈھل آئے گا

الماس شبی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر جاگے تو ہمیں خون میں تر دیکھیں گے
سنگ آنکھیں نہیں رکھتے ہیں کہ سر دیکھیں گے

غزل

محفلوں میں رہا پھر بھی تنہا رہا
ساتھ میرے فقط میرا سایہ رہا

تیرا ملنا بچھڑنا تھا اک حادثہ
حادثوں کو مقدر سمجھتا رہا

اب رہی وہ کہاں مجھ میں خود داریاں
سوچتا ہوں میرے پاس اب کیا رہا

بھول جانا تجھے میرے بس میں نہ تھا
بس تجھے رات دن یاد کرتا رہا

دو کنارے تھے چلتے رہے ساتھ ساتھ
دو کناروں کے بیچ ایک دریا رہا

پوچھا تو نے نہ اشفاق سے حال دل
خود ہی کہتا رہا خود ہی سنتا رہا

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزل

نظر میں روشنی جب تک
طلوعِ آ گہی جب تک

حسیں لگتے رہو گے تم
ہے رخ پر تازگی جب تک

مسائل زندہ رہنے ہیں
ہے باقی زندگی جب تک

یہ سپنے آئیں گے تب تک
ہیں آنکھیں جاگتی جب تک

نہ سونے دے ترا رونا
بجے گی راگنی جب تک

سیانے ہم کو مانیں گے
ہے گندم سال کی جب تک

ہے قدر و منزلت اسکی
کمائے آدمی جب تک

وہی ہیں چار دن قیصر
رہے گی چاندنی جب تک

نبیل قیصر

غزل

خوابوں کی بیاس لے کے بیاباں میں آ گئے
ہم اپنی ہی صدا سے گریزاں میں آ گئے

عمرِ رواں کو موڑنے نکلی تھی آرزو
لیکن تھکے ہوئے قدم ایواں میں آ گئے

برسوں کی خاک چھان کے پلکوں سے چُن لیا
پھر اشک بن کے یاد کے عنواں میں آ گئے

تنہائیاں تھیں ساتھ، سو چپ چاپ چل دیے
رستے میں کچھ چراغ فروزاں میں آ گئے

دیوار و در سے پوچھا کہ ہم کس کے خواب تھے
خاموشیاں لرز کے بیاباں میں آ گئے

اتنا ہنسے کہ ہونٹ پہ چھالے پڑے رہے
اور درد کے کھرے سبھی میزاں میں آ گئے

ہم نے تو خاک چھانی تھی سورج کی دھوپ میں
کیا جانیے کہ چاند شبستاں میں آ گئے

شاہ روم خان ولی

غزل

میں وہ سوچتا ہوں جو ہے خیال سے ماورا
اسے دیکھ لوں جو ہے خد و خال سے ماورا

میں نکل چکا ہوں زماں، مکاں کی حدود سے
سو مرا وجود ہے ماہ و سال سے ماورا

ترے سامنے میں بیان کر نہیں پا رہا
مرا مسئلہ ہے مرے سوال سے ماورا

یہ جو جسم و جان کا کھیل ہے نہیں چاہیے
مجھے وصل چاہیے اب وصال سے ماورا

مری خاک سے تری روح ملنے کی دیر تھی
میں صغیر اب ہوں ہر اک مثال سے ماورا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھیے اب کس ہوا میں پنکھ پھیلاتا ہُوں مَیں
کِن دیاروں کی طرف پرواز کر جاتا ہُوں مَیں

غزل

دماغ پھیر رہا ہے یہ تاج تیرا بھی
بگاڑ دے گی حکومت مزاج تیرا بھی

عروجِ بام سے اترا تو جان جائے گا
مرا نہیں تو نہیں ہے سماج تیرا بھی

یہاں کسی کا بھی سکہ سدا نہیں چلتا
ہمیشہ رہنا نہیں ہے رواج تیرا بھی

تو کیوں یہ روح کی باتیں سنائے جاتا ہے
جو مسئلہ ہے فقط احتیاج تیرا بھی

اڑایا جیسے برس کر عتاب میں مرا رنگ
ملمع ایسے ہی اترا ہے آج تیرا بھی

یہ گوشوارہ مکمل نہیں ہوا کیسے
بیاضِ دل میں ہوا اندراج تیرا بھی

وہ خوش گمان مجھے کہہ گیا دمِ رخصت
مرض نہیں ہے بہت لاعلاج تیرا بھی

مجھے غرور سے معزول کرنے والے سن
نہ رہنے دوں گا ترے دل پہ راج تیرا بھی

اکرم جاذب

غزل

جو دل میں نہیں ہوتا وہ کہتے ہو زباں سے
تم ایسا ہنر بولو کہ لائے ہو کہاں سے

سرتاپا دعا ہو کہ وہ لوٹ آئے کماں میں
جو تیر چلایا تھا کبھی تم نے کماں سے

یہ کیسی تمنا ہے کہ میں پھر سے سناؤں
افسانے کو چھوڑا تھا کبھی تم نے جہاں سے

اس میں بڑے پر پیچ مقام آتے ہیں واللہ
گو دور نہیں ہے ترا گھر میرے مکاں سے

یہ گیت بجز سوزِ دروں کچھ بھی نہیں ہیں
ہم لکھیں گے فرصت جو ملی آہ و فغاں سے

پھوٹے گی انہیں سے کبھی قندیل یقیں کی
مایوس نہ ہو شورشِ شوریدہ گماں سے

وہ ثبت ہوا گردشِ دوراں کی جبیں پر
وہ گیت جو ابھرا تھا کبھی درد نہاں سے

راجہ عبدالقیوم

غزل

اسد رضا سحر

علیحدگی کو چنا اور کم سے کم بولے
طنابِ زیست میں آئی لچک تو ہم بولے

بدن کو نوچ لیا خواہشوں کے لشکر نے
ابھی تلک نہ ترے صاحبِ ستم بولے

یہ ضبط اب میری تضحیک پر اتر آیا
سو میرا دل ہے مری آنکھ کا یہ نم بولے

مرے وجود پہ ہنسنے لگی تھی رمزِ حیات
اسی لیے تو مرے حق میں اتنے غم بولے

ترس گئی ہے سماعت حسین لہجے کو
اُسے کہو اُسے اللہ کی قسم بولے

تجھے جو دیکھے تو اندھا بھی دیکھ لے دنیا
تجھے جو سوچے تو گونگا بھی ایک دم بولے

غزل

نہ آسماں ہی رہے گا سر پر نہ پاؤں نیچے زمیں ملے گی
ہوا کا رخ اب جدھر کو ہو گا تمھیں یہ خلقت وہیں ملے گی

وفا ہے ناپید اب جہاں میں غرض کی بستی میں ہے بسیرا
غرض کے رشتے ہیں سارے رشتے ہزار چاہو نہیں ملے گی

وہ سوچتا تھا میں ناسمجھ تھی جو اسکا دھوکا نہ جانچ پائی
کہ لوٹ کے میں کبھی جو آیا یہ لڑکی مجھ کو وہیں ملے گی

مرے ترازو میں تول دیکھو کہ مول کتنا ہے کم تمہارا
وفا کی بولی لگے گی جب بھی جھکی تمہاری جبیں ملے گی

جو اتنے برسوں تھی خاک چھانی سفر یہ سارا ہی رائیگاں تھا
نہ دیکھ سپنے تو شانتی کے کہاں ہے وہ جو کہیں ملے گی

یہ ہجرتوں کا ملال چھوڑو کبھی تو ہو گا وصال چھوڑو
تمہارے کوچے میں مر گئے ہم تو کیا وہ دو گز زمیں ملے گی

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

انا اجاڑ چکے، خال و خد بگاڑ چکے
اب اپنے ہونے کا انکار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

شہر سارا سنورنے والا تھا
چاند چہرہ ابھرنے والا تھا

کاٹ کر رکھ دیے ہیں ہاتھ اس نے
میں کوئی کام کرنے والا تھا

اس نے بخشی ہے بھول آنکھوں کی
میں تو تاوان بھرنے والا تھا

سو رہا تھا میں اپنی کٹیا میں
اور سورج اترنے والا تھا

عشق نے چن لیا زہے قسمت
ورنہ بے کار مرنے والا تھا

دل نے پھر بھی کیا یقیں اس پر
اس کا لہجہ مکرنے والا تھا

اس نے دامن میں بھر لیا اصغر
دل کا سونا بکھرنے والا تھا

اصغر علی بلوچ

غزل

بھنور ، کشتی ، کنارا دیکھتے ہیں
سفر کا استعارہ دیکھتے ہیں

یہاں کچھ دیر تو رکنا پڑے گا
پسِ پردہ اشارا دیکھتے ہیں

ترے لہجے سے مجھ پر کھل رہا ہے
محبت میں خسارا دیکھتے ہیں

ہمیں تو چھوڑ کر سب جا چکے تھے
یہ پھر کس نے پکارا ، دیکھتے ہیں

یہ دریا چار سو پھیلا ہوا ہے
اگر اس کا کنارا دیکھتے ہیں

یہ ہم جو دیکھتے ہیں تیری جانب
مسافر ہیں ، ستارا دیکھتے ہیں

مجھے تو شب نظر آتی ہے عاصم
سحر ہے تو دوبارہ دیکھتے ہیں

عاصم اعجاز

غزل

ایک ندی رواں تھی خیالات کی
لوگ کہتے ہیں ہم نے بڑی بات کی

ہم نہیں تھے کہیں وہ نہیں تھے کہیں
بس یہی تھی کہانی ملاقات کی

راز کو راز رکھنا نہیں آتا ہے
بات کس کو بتائیں یہاں رات کی

ان کو شکوہ رہا خامشی کا مری
کیا قدر تھی انہیں میرے جذبات کی

چھوڑ دیتے غزل لکھنا کب کی کلیم
بات ہوتی اگر میری اک ذات کی

محمد کلیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دن رات محو اپنی ثنا خوانیوں میں تھا
خالد بھی اپنے عہد کے خاقانیوں میں تھا

غزل

جانے اُفق کے پار میں کب دیکھنے لگا
شاید کہیں عدم میں تھا تب دیکھنے لگا

عادت سی ہے عجیب خیالات کی مجھے
بچپن ہی سے میں خواب عجب دیکھنے لگا

میں دیکھ کر بھی دیکھ نہیں پا رہا تھا کچھ
آنکھیں کھلی ہیں ایسی کہ سب دیکھنے لگا

منظر عجب طرح کا کُھلا سامنے مرے
میں دیکھتا ہی رہ گیا جب دیکھنے لگا

دل میں کسی کی کون سی ہے آرزو چُھپی
کس کی نظر میں کیا ہے طلب دیکھنے لگا

ہر رنگ کی پہیلی سمجھنے لگا ہوں میں
کب ہو گا پھیکا رنگِ طرب دیکھنے لگا

سُرمہ بنا لیا ہے تری خاکِ راہ کو
میں سخت تیرگی میں بھی اب دیکھنے لگا

دیکھا ہے پہلی بار کسی نے مجھے امر
اور میں کہ دیکھنے کا سبب دیکھنے لگا

امر مہکی

غزل

چاندنی رات کے منظر کو بھلاؤں کیسے
تیری یادوں کے میں لشکر کو بھلاؤں کیسے

جس میں امواج محبت کی بہا کرتی تھیں
اس محبت کے سمندر کو بھلاؤں کیسے

جس سے ملنا مری قسمت میں نہ تھا ہائے مگر
اس تمنائے مکرر کو بھلاؤں کیسے

جس نے خوابوں میں بھی آ آ کے ستایا مجھ کو
اس تخیل کے ستم گر کو بھلاؤں کیسے

تجھ سے نظریں کبھی ہٹتی نہ تھی میرے ہمدم
تیرے رخسار کے انور کو بھلاؤں کیسے

دل پہ مسعود کے جو نقشہ ہے یادوں کا تری
اس محبت کے مصور کو بھلاؤں کیسے

احمد مسعود قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی ، کرتا بھی تو کیا میں
سو ، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

غزل

آنکھ کہتی بھی رہی اشک فشانی بارے
میں نے سوچا ہی نہیں اپنی کہانی بارے

کون کرتا ہے بھلا چشم نمائی ایسے
ہم تو سنتے تھے تری نرم بیانی بارے

حق تو بنتا ہے نظر آئے غزل کے اندر
سن تو رکھا ہوگا دریا کی روانی بارے

تیرے پہلو میں ہی رہنا ہے جہاں رہنا ہے
کبھی سوچا ہی نہیں نقل مکانی بارے

صبح آباد ہے اور شام ہے افتاد کوئی
کوئی تمثیل نہیں اور جوانی بارے

ایک ہی وقت میں قاتل بھی ہے مقتول بھی ہے
وصف کیسے میں بتاؤں ترے پانی بارے

کب، قمر، غیر اہم اتنا ہے موقف اس کا
کوئی ترتیب ہو پیغام رسانی بارے

قمر نیاز

غزل

تذکرے ہو چکے میاں معدوم
ہو گئی یادِ رفتگاں معدوم

ہو چکی لکھنؤ کی گلیوں میں
میر باقر* کی داستاں معدوم

راہ کھوئی ، سواریاں خودکار
گاڑیاں ہیں تو کوچواں معدوم

ذائقے ، رنگ ، روشنی ، خوشبو
کیا ہوئے سب وہ جانِ جاں معدوم

صبح دم بج رہی تھیں گرجے میں
شور میں اب ہیں گھنٹیاں معدوم

ہیں کہیں پر نشانیاں روشن
اور کہیں پر ترے نشاں معدوم

کیا ہے معلول اور کیا عِلت
کیا ہے موہوم اور کہاں معدوم

کارگاہ اجل ہے وقت نہ پوچھ
وہاں موجود تھا ، یہاں معدوم

لب پہ آیا تھا نعرۂ منصور
ہو گئی حدِ لامکاں معدوم

عابد رضا

غزلیں

یہ فسوں ہے کہ اک فسانہ ہے
دل کا موسم بہت سہانا ہے

یہ تعلق نیا مبارک ہو
کل کو اس نے بھی ٹوٹ جانا ہے

آج تجدید کی خوشی ہے تمہیں
ورنہ رشتہ وہی پرانا ہے

کون کتنے قریب رہتا تھا
دور کس کا ہوا ٹھکانا ہے

کل جو گھٹنے ہمارے چھوتے تھے
ان کے ہاتھوں میں تازیانہ ہے

تم نے قصیدہ پڑھنا ہے اپنا
ہم نے پھر مرثیہ سنانا ہے

اورنگزیب حسام حر

گماں سے دور تھے کوسوں تری تصویر تیرا خط
اچانک مل گئے دونوں تری تصویر تیرا خط

گھڑی کی سوئیاں اپنے مقرر راستے پر تھیں
مگر سوچا کیے گھنٹوں تری تصویر تیرا خط

ہمارے گھر میں لکڑی کا وہ اک صندوق خالی ہے
جہاں رکھے رہے برسوں تری تصویر تیرا خط

ہم اپنے آپ سے ہٹ کر کہاں تک دیکھتے جائیں
بسائے آنکھ میں پہروں تری تصویر تیرا خط

سڑک کے دوسری جانب نظر کی آخری حد تک
کبھی ساون کبھی بھادوں تری تصویر تیرا خط

ابھی تک ایک بوسیدہ سا دروازہ کھلا پاؤں
جہاں چسپاں رہیں صدیوں تری تصویر تیرا خط

مبادا خوف کے مارے ستارے جھلملانے سے
جھلس کر راکھ اک دن ہوں تری تصویر تیرا خط

غزل

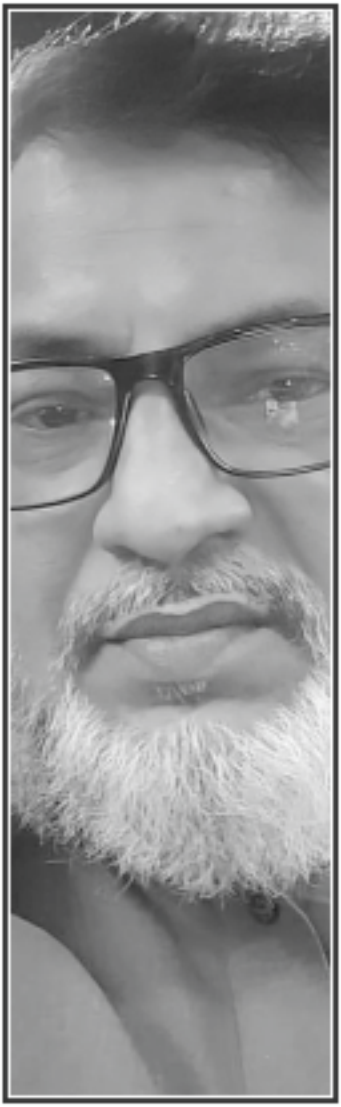

نظام سارا ہی شاید غلط حساب میں ہے
وگرنہ کیوں یہ زمانہ کسی عذاب میں ہے

سکون ڈھونڈنے نکلے تھے ہم زمانے میں
مگر یہ دل تو ابھی تک اک اضطراب میں ہے

کریدتے ہو جو اب راکھ میرے ماضی کی
بتاؤ کیا کوئی شعلہ ابھی حجاب میں ہے

ہزار چہرے لیے پھر رہی ہے یہ دنیا
مگر وہ چہرہ ابھی تک کسی گلاب میں ہے

اگرچہ وقت کی دیوار سخت ہے لیکن
مزاحمت کا دیا پھر بھی آفتاب میں ہے

گلہ کریں بھی تو کس سے کہ شہر کا ہر شخص
خود اپنے آپ سے الجھا ہوا شتاب میں ہے

نظر بچا کے وہ گزرے ہیں اس طرح خالد
رہِ وفا کا ہر اک موڑ اب سراب میں ہے

رانا خالد قیصر

غزل

درد کو دھڑکن سے جانے میں وقت لگے گا
اب ہونٹوں کو مسکانے میں وقت لگے گا

اس کے پیار نے بے ترتیب کیا ہے اتنا
الجھ کے خود کو سلجھانے میں وقت لگے گا

بہتر یہ ہے اچھی طرح سے سوچ لو تم بھی
ٹھکرا کے پھر اپنانے میں وقت لگے گا

کس کو یہ معلوم تھا کوئی بچھڑے گا تو
اپنے دل کو سمجھانے میں وقت لگے گا

تیری جدائی نے مجھ کو بے حس کر ڈالا
اب یہ پتھر پگھلانے میں وقت لگے گا

بچھڑ کے اس سے آج یہ خالق سوچتے ہیں ہم
اب اس زخم کو بھر جانے میں وقت لگے گا

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زیبِ پا حلقۂ غم تیرا تھا
ہاتھ میرے تھے علم تیرا تھا

غزل

جیا قریشی

جو دل کو پیار کی خوشبو سے بھر لیا ہوتا
تو زندگی کا سفر سہل کر لیا ہوتا

خزاں کی رت کو امر جان کر اداس رہے
بہار کا بھی ذرا سا اثر لیا ہوتا

ہمیشہ یوں نہیں ہوتا مگر یہ خواہشِ دل
کہ جس نے پیڑ لگایا ثمر لیا ہوتا

قدم قدم پہ کھلی دیکھ لی کتابِ حیات
کوئی سبق تو مرے ہمسفر! لیا ہوتا

گرجتے آئے ہو میدان میں بمعہ لشکر
بنامِ امن بھی زادِ سفر لیا ہوتا

مذاکرات ضروری سہی جیا لیکن
یہ کام جنگ سے پہلے جو کر لیا ہوتا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ خوف تھا کہ فقط وہم تھا کہ دھوکا تھا
نہ جانے کیا اسے خود اس سے دُور رکھتا تھا

غزل

گلشن میں نظر آتا ہے جب روز تماشا!
پھر خاک مرے دل میں سمائے تری دنیا

کلیوں کو مسلتے ہیں گلستان کے مالی
گلشن کی بہاروں کو نگہباں نے اجاڑا

بے تاب پکاروں تو سنائی نہیں دیتا
اس دل کے نہاں خانے میں یہ شور ہے کیسا؟

اک درد کہ وہ درد ہے سرمایہء ہستی
اک شخص کہ وہ شخص ہے تسکین سراپا

آ دیکھ کبھی حالتِ خستہ، مرے منعم!
مجھ کو ترے الطاف و عنایات نے مارا

بیٹھی ہوں اسی شخص پہ دل، جان لٹائے
وہ شخص کہ جو مجھ سے محبت نہیں کرتا

ہر شخص کو احساس کی دولت نہیں ملتی
ہر شخص نہیں ہوتا ہر اک درد کا چارا

ہر ایک کی قسمت میں محبت نہیں ہوتی
ہر ایک کی قسمت میں جو لکھا ہے، وہ ہوگا!

مسکان لبِ ساحلِ حسرت پہ کھڑی ہوں!
اور دیکھتی ہوں درد سے بپھرا ہوا دریا

مسکان گل

غزل

ان سے کہہ دو جو نشانہ ہیں لگانے والے
ہم کہ شاہین ہیں زد پر نہیں آنے والے؟؟

کون قاتل ہیں یہ معلوم ہے سب کو لیکن
نام انکے کسی لب پر نہیں آنے والے

کانچ کالے کے بدن آپ یہ نکلے ہیں کہاں
کیا کسی سمت سے پتھر نہیں آنے والے؟

منتسم سب میں برابر ہیں عطائیں اس کی
ملتجی لہجوں سے پا لیتے ہیں پانے والے

خاک ہونا ہے سبھی کو یہاں جستہ جستہ
بھول کیوں جاتے ہیں یہ بات زمانے والے

خاک چھانی ہے مگر مل نہ سکا وہ چہرہ
اب وہ چہرے ہی نہیں دل کو لبھانے والے

جب تلک ہیں کرو تعظیم میاں تم ان کی
لوٹ کر پھر نہیں آئیں گے یہ جانے والے

غم ہو یا زخم ہو ہیں مجھ کو عزیز اے اصغر
یہ تو ہوتے نہیں دنیا کو دکھانے والے

محبوب خان اصغر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ دیکھ لیں نہ مرے عجز کی اُٹھان کہیں
لگا نہ دیں غمِ نو سال پر لگان کہیں

غزل

یونہی نہیں ہے ذکر، محبت میں پھول کا
رنگت اڑی ہے، خوشبو مگر ان گلوں میں ہے

اپنا بنا کے اپنوں سے، یہ بڑھ کے ہیں رہیں
یہ خونگر کے سارے ہی، ان باسیوں میں ہے

معیوب جن کی شاعری ہو جنگلے شعر ہوں
کیونکر شمار ان کا بڑے شاعروں میں ہے

دل پھینکنے کی عادتیں، اس کو پڑی ہوئیں
میرے علاوہ سب کے ہی، رہتا دلوں میں ہے

دل میں ہیں شادیانے، ترے ذکر سے بجیں
سارا ہی شور چپ کا، انہی دھڑکنوں میں ہے

نزدیکیوں میں ہیں کہاں، وہ قربتیں بھی گل!
ساری ہی خوش نمائی، انہی فاصلوں میں ہے

کوکل گل

انتخاب

— خالد احمد —

کچھ جدائی کے دامن میں بھی چھوڑ دیں
ربط رکھیں ، اگر دوستی چھوڑ دیں

نعمان منظور

غزل

غمِ جہان بھلاتا نہ میں تو کیا کرتا
اسے جو دل میں بساتا نہ میں تو کیا کرتا

سفر طویل تھا اور دل تھکن سے چور بہت
''پرایا بوجھ اٹھاتا نہ میں تو کیا کرتا''

یقین جان بہت بات بڑھ گئی ہوتی
اسے جو ہنس کے مناتا نہ میں تو کیا کرتا

حقیقتوں سے چرانے لگے تھے لوگ نظر
پھر آئنہ جو دکھاتا نہ میں تو کیا کرتا

وہ گرنے والا تھا غفلت سے گہری کھائی میں
اُسے جو زین! جگاتا نہ میں تو کیا کرتا

عبدالرؤف زین

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

غزل

ہر گھڑی یہ قیاس رہتا ہے
وہ کہیں آس پاس رہتا ہے

میرے دل کا مزاج ایسا ہے
غم کا موسم ہی راس رہتا ہے

ایک دن تم بھی چھوڑ جاؤ گے
عمر بھر کون پاس رہتا ہے؟

اپنی اپنی زبان ہے اُردو
جس سے تو ناشناس رہتا ہے

اُن لبوں سے کریں بغاوت کیا؟
جن پہ حرفِ سپاس رہتا ہے

دوسرا کون ہے مرے جیسا؟
کیوں مجھے التباس رہتا ہے؟

جانے کس دیس آ بسا ہوں میں؟
بے سبب دل اُداس رہتا ہے

موت اک بار آتی ہے لیکن
زندگی بھر ہراس رہتا ہے

ایک مہمان کیا گیا گھر سے
گھر بھی تابش اُداس رہتا ہے

تابش خواجہ آبادی

غزل

مجنوں سا دل سراب سے بھی مُطمئن نہیں
پیاسا ہے، پر چناب سے بھی مُطمئن نہیں

دیکھا ہے جب سے جلوۂ بے رنگ و بو کہیں
دل عالمِ شباب سے بھی مُطمئن نہیں

جس کی نظر میں جچ گئی منزل بقا کی اب
وہ زیست کی کتاب سے بھی مُطمئن نہیں

اُلجھا ہوا ہے زندگی تیرے سوال میں
اب وہ کسی جواب سے بھی مُطمئن نہیں

جس کو تڑپ لگی ہو حقیقت کی اے شفی
وہ نورِ ماہتاب سے بھی مُطمئن نہیں

ملک شفقت اللہ شفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کسی طرح نہ مرے دل کا قفل کھل پایا
ہوا نہ مجھ سے اِسی ایک درد کا چارا

غزل

خواب سے اس کی خبر مجھ کو ملی
بند آنکھوں سے نظر مجھ کو ملی

یوں ہی گزرے گی مری اس کے بغیر
زندگی پھر بھی اگر مجھ کو ملی

جاگتے سوتے سفر ہوتا رہا
ایک چلتی رہگزر مجھ کو ملی

نور کا مفہوم آنکھوں پر کھلا
رات دیکھی تو سحر مجھ کو ملی

پہلے صحرا کی طرف جاتے تھے لوگ
یہ سہولت اپنے گھر مجھ کو ملی

چھٹ گئی ہے جان ظاہر سے کنور
صحبتِ اہلِ نظر مجھ کو ملی

کنور امتیاز احمد

''لسانی زاویے'' کا مختصر تعارف

''لسانی زاویے'' اردو زبان و بیان اور قواعد کے مختلف پہلوؤں اور مسائل کے حوالے سے ممتاز ماہرِ لسانیات غازی علم الدین کے علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ایک بہت وقیع اور معیاری کتاب ہے - لسانی مباحث سے دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ قاری کو مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے مندرجات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے- دیکھئے یہ اپنے دامن میں کیسے کیسے بیش بہا موضوعات سمیٹے ہوئے ہے-

اضافتِ مقلوب اور ہماری نافہمی

+ علاوہ کی ذو معنویت اور ابہام و اہمال

+ لفظ اور معنی کی تکرار کا عیب

+ اردو کا عددی نظام (لسانی تناظر میں)

+ ''یت'' کا لاحقہ -- کس حد تک جائز ہے؟ (ایک لسانی مطالعہ)

+ اردو میں امالہ ---- ایک مطالعہ (لسانی تناظر میں)

+ کلمۂ ربط ''سے'' کی معنوی جہتیں

+ جمع کے تعلق سے بعض لسانی مغالطے

+ یہ ترکیبیں مروج ہیں مگر --- (ایک لسانی نقطۂ نظر)

+ فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک

+ نام رکھنے، لکھنے اور پکارنے کی مشکلات (ایک لسانی مطالعہ)

+ لاحقۂ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' کے جمالیاتی رنگ (لسانی تناظر میں)

+ ہندی الاصل مصادر سے مشتق ''نون'' پر ختم ہونے والے الفاظ (لسانی تناظر میں)

+ ''کے حوالے سے'' کا غلط استعمال

+ اسمِ فاعل کے آخری حرف کی ''یا'' میں تبدیلی

+ تعقیدِ لفظی کا عیب

جلیل عالی

+حرفِ عطف کا غلط استعمال
+لفظ ''حکمتِ عملی'' کا غلط استعمال
+''مجھے'' فاعل کا نہیں مفعول کا حرف ہے
+برقی ذرائع ابلاغ کی ایک انوکھی اختراع
+بہنا، سہنا اور کہنا سے فعلِ امر کا غلط املا
+''خوبصورت'' کا بے جا استعمال
+مصدر میمی ''محبت'' وغیرہ کا تلفظ
+ثبات اور نبات میں فرق
+غلطی ہائے مضامین
+ اردو حریفہ مکالے ------ من الفِ الیمراث (اردو کے متوازی ایک نئی زبان)
+ اردو، ہندی اور ''ہندوستانی'' ..... پروفیسر عبدالستار دلوی کا نقطہ نظر (غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)

پروفیسر غازی علم الدین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایسے ادق اور خشک نکات کو بھی اتنے سہل اور دلپذیر انداز سے بیان کیا ہے کہ قرأت میں کہیں بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ تلاش و تجسس کے انہماک میں اضافہ ہوتا ہے۔

ترکیبِ مقلوب کے حوالے سے لکھا گیا مضمون میں نے اور بھی زیادہ دلچسپی سے پڑھا کیونکہ مجھے جو بے اضافتی تراکیب تراشنے کا شوق ہے اس کے بہت سے پہلو اس سے متعلق ہیں۔ میری اس روش کو کچھ دوستوں نے ترکیبِ مقلوب ہی تصور کیا جس سے میں پوری طرح متفق و مطمئن نہ ہو پایا۔

اس لیے کہ مجھے ہمیشہ یہ لگا کہ ترکیبِ مقلوب کی اصطلاح بے اضافتی تراکیب کی تمام صورتوں کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ کیونکہ بے اضافتی تراکیب کہیں تشبیہاتی پہلو لیے ہوتی ہیں اور کہیں حروف جار ''کا، کے، کی'' کے محذوف ہونے کے علاوہ بعض دیگر صورتیں سامنے لاتی ہیں۔

خاص طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کو ترکیبِ اضافی کی صورت ملانا اس لیے معیوب نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں کوئی مذہبی یا تہذیبی رکاوٹ ہے بل کہ یوں دو زبانوں کے لسانی آہنگ کی نا موافقت آڑے آتی ہے۔ لیکن بے اضافتی ترکیب کی بعض صورتوں میں عربی و ہندی یا فارسی و ہندی الفاظ صوتی لحاظ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں یا ان کی ہم نا آہنگی اتنی کم ہو جاتی ہے کہ وہ سماعت پر گراں نہیں گزرتی۔ مثلاً اگر ہم سمندر شوق کہیں تو سماعت کو ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ لیکن شوق سمندر کہنے سے سماعت کو کوئی جھٹکا نہیں لگتا۔

ایک اور مثال دیکھیے:

نگرِ احساس کہنے سے لطافتِ احساس مجروح ہوتی ہے۔ مگر احساس نگر کہنے میں دونوں زبانوں کے الفاظ میں ایک صوتی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر ہندی کے دو الفاظ کو تو آپ ترکیبِ اضافت کی صورت دے ہی نہیں سکتے مگر بے اضافتی ترکیب کا چلن تو ہندی میں عام ہے۔

جیسے ''پریت نگر''، ''پریم دیوانہ''

میری ایک ایسی ہی بے اضافتی ترکیب ہے ''آنکھ پتلی''

پھر میں نے ایک تجربہ یہ بھی کیا کہ ترکیبِ اضافی اور بے اضافی ترکیب کو اکٹھا کر دیا۔

جیسے:

''قصۂ شوق مسافر'' ہے بس اتنا عالی
کہیں بے طرح بکھرنا کہیں یکجا ہونا

.....

ایک اور صورت بے اضافتی ترکیب سے بیک وقت ''کا، کی'' کے ساتھ ساتھ ''میں'' یا ''میں سے'' کے محذوف ہونے کی بھی ہے۔ جیسے

بوجھے کون ''سراب دریچوں'' چاند پہیلی کریں یہاں سب اپنا اپنا نام تماشا

.....

سراب دریچوں یعنی سراب کے دریچے میں سے۔

اب کیا اس طرح کی صورتوں کو محض ترکیبِ مقلوب کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے؟

میرے خیال میں بے اضافتی ترکیب اور ترکیبِ مقلوب کی جملہ صورتوں کی مماثلتوں اور مفارق کے مسئلے کو زیادہ توجہ سے دیکھنے، سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔

یاد رہے غازی علم الدین کا زبان بارے رویہ تنگ نظری اور حد سے بڑھی ہوئی خالصیت پسندی کا نہیں ہے۔ وہ زبان کو کوئی جامد شے نہیں سمجھتے۔ تخلیقی لسانی اختراعات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تاہم اجتہادی سلیقے سے عاری اور لسانی بے شعوری میں کی جانے والی زبان کی غلطیوں کی نشاندہی ضروری خیال کرتے ہیں۔ یوں کسی امر میں ان سے نا متفق تو ہوا جا سکتا ہے مگر ان کی کاوشوں کی علمی و تحقیقی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لسانی حوالوں سے اردو میں خال خال تحریریں ہی سامنے آتی ہیں غازی صاحب نے بے حد محنت اور عرق ریزی سے لکھے ہوئے ان مضامین کو یکجا کر کے اس ضمن میں نہایت قابلِ قدر خدمت سرانجام دی ہے۔ بے شک یہ کتاب لسانی مباحث میں ایک معتبر حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆☆☆

شرف الدین شامی کی کتاب ''محاصرہ'' پر ایک نظر

ہر دل عزیز دانشور، شاعر اور ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی پر نڈھال و بے حال شرف الدّین شامی کی کتاب ''محاصرہ'' ابھی ابھی بل کہ تین چار دن قبل ہی شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ ملتِ اسلامیہ کو درپیش صیہونی و یہودی جارحیت اور بے رحمی کے خلاف ایک بلند بانگ صدائے احتجاج ہے۔

''محاصرہ'' مشہور شاعر احمد فراز کی ایک نظم کا عنوان تھا اور اس نظم نے ادبی، علمی اور سیاسی حلقوں میں بڑی شہرت پائی تھی کہ یہ قلمکاروں پر اپنے وطن اور اس پر مسلط طاقتوروں کی بے جا پابندیوں کی داستان تھی۔ اس نظم کی اہمیت اپنی جگہ، مگر شرف الدین شامی کی کتاب ایک بہت وسیع کینوس کا احاطہ کرتے ہوئے صہیونیوں اور یہودیوں کی سرزمینِ فلسطین و غزہ پر جبر و تشدد، قتل و غارت، تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر مسلمانوں کی زندگی عذاب کرنے کے مذموم عمل میں یہود و ہنود کی غلیظ داستان بھی شعری زبان میں بیان کرتی ہے۔ تین سو بیس صفحات کی ضخامت پر مشتمل اس کتاب میں شامی کی تقریباً ایک سو انیس مختلف الاصناف نظمیں اور کچھ نثری تحریریں شامل ہیں۔ جو ان کی تخلیقی زرخیزی کے ساتھ ساتھ ایک حساس اور دردمند دل کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

شرف الدین شامی ایک نعت گو کے طور پر بھی تقدیسی حلقوں میں اپنی انفرادیت منوا چکے ہیں۔ وہ غزل میں جتنے رواں دواں ہیں اتنے ہی نظم کی نسبت سے بھی ایک ایسے باکمال شاعر ہیں جن کے شعری محاسن کی تعریف تو کی جا سکتی ہے مگر شعری معائب شاید ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکیں۔ نظمِ معرّیٰ کے ساتھ ساتھ وہ آزاد نظمیں بھی لکھ رہے ہیں اور ان کا دینی رجحان

نسیمِ سحر

ایک طوفانی جذبے کی صورت میں موج در موج ان کی شاعری میں کروٹیں لے رہا ہے۔ان کی شاعری کے خطے میں ماضی قریب ہی میں نثری نظم بھی داخل ہو چکی ہے، اور زیرِ نظر کتاب میں ان کی پابند نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔وہ جو نظمیں تحریر کر رہے ہیں نعت کے وسیع تر معنوں میں انہیں بہر طور نعتیہ کلام ہی کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے مطابق عصرِ حاضر میں امت مسلمہ کو پیش آمدہ مسائل اور ایسے کسی المیے کی آنچ اور درد اگر کسی نعت گو شاعر کے کلام میں شامل نہیں تو یوں جانیے کہ وہ نعت کی روح سے واقف ہی نہیں ہے بل کہ نعت گوئی کا حق ادا نہیں کر رہا۔ چنانچہ شامی کے تخلیقی اسلوب کے مطابق فلسطین پر ان کی اس کتاب میں شامل نظموں کو نعت ہی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ بلاشبہ وہ قلم کے محاذ پر جہاد کر رہے ہیں اور ایک انفرادی شکل میں اجتماعی فریضہ ادا کر رہے ہیں جسے دیگر اہلِ قلم کماحقہٗ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ معروف سینئر شاعر پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر نے لکھا ہے جبکہ بزرگ محقق اور شاعر ڈاکٹر عزیز احسن نے اپنے خیال انگیز مضمون میں ''محاصرہ'' کو اُمتِ مسلمہ کی ابتلا پر استقامت کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے رجز اور عمومی بے حسی کا نوحہ ٹھہرایا ہے۔ سینئر شاعر اور سفارتکار سید ابرار حسین نے بھی تقریظ میں شامی کی تخلیقی کائنات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس سلگتے ہوئے مسئلے پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ راقم نے بھی اپنے دیباچے میں شامی کے تخلیقی سفر اور اس موضوع پر ابتدا ہی سے ان کے رجحانات کی نشان دہی کی ہے۔

یہاں درجِ بالا اہلِ درد دانشوروں اور محققین کی بیش قیمت آرا کے کچھ مختصر اقتباسات قارئین کی نذر اس لیے کیے جا رہے ہیں کہ انہیں اس کتاب کی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ اس المیے اور سفاکیت کا کچھ اندازہ ہو سکے جس میں ماضی سے اب تک امتِ مسلمہ گرفتار ہے:

''آج فلسطین میں امریکہ کی شہہ پر اسرائیل نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس پر مسلم دنیا کے حکمران خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔۔ اسی طرح اہلِ قلم بھی حق گوئی کا فریضہ ادا کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔

اندریں صورت شرف الدین شامی نے 'محاصرہ' کے نام سے فلسطینیوں سے یک جہتی کا مظاہرہ کر کے گویا پاکستان کے اہلِ قلم کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی سعی کی ہے اور مسلم قوم کو اس کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔'' (ڈاکٹر

عزیز احسن)

''شرف الدین شامی کا دل اہلِ فلسطین کیے ساتھ دھڑکتا ہے۔ ارضِ فلسطین ان کے لیے صرف ایک مسلم علاقہ نہیں بل کہ وہ جگہ ہے جہاں قبلۂ اوّل ہے۔ اس لیے فلسطین کے بارے میں ان کی نظم صرف شاعری نہیں ہوتی بل کہ ان کے اخلاص، ان کے جذبے اور ان کی للّٰہیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔'' (سیّد ابرار حسین)

راقم السطور نے محسوس کیا ہے کہ ان نظموں میں کیفیات میں ڈھلی ہوئی ایک ایسی کرب آمیز نغمگی ہے جو غزل کے سریلے پن اور موسیقیت کے قائل قاری کا دل بھی لبھاتی ہیں اور اسے احساس دلاتی ہے کہ اصل نغمگی اور تاثیر غزل، پابند نظم، آزاد نظم یا نثری نظم میں نہیں ہوتی بل کہ اس کا اوّلیں ماخذ و منبع تخلیق کار کا خیال ہوتا ہے۔ اب یہ قاری کا ابلاغی مسئلہ جانیے کہ اس نے کچھ عروضی اوزان و بحور میں تو یہ نغمگی اور ردھم دریافت کر لی مگر ابھی اس کائنات کی بہت سی نغمگی اور ردھم نادریافت ہے۔ اس صورت حال کا شکار آزاد اور نثری نظمیں خاص طور پر ہیں جبکہ پابند نظم کسی حد تک پابند قافیوں اور برابر کے مصرعوں کی بدولت قاری کی غنائیت اور نغمگی کے ذوق کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ شرف الدین شامی کی نظم پابند ہو، آزاد ہو یا نثری، اپنے موضوع کی نوعیت کے لحاظ سے پوری پوری تخلیقی ہنرکاری کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔

کئی عرصے سے وہ نعتیہ مشاعروں میں جو نظمیں پیش کر رہے ہیں وہ ایسی ہیں کہ نعت کے وسیع تر معنوں میں انہیں بہر طور نعتیہ کلام ہی کہا جا سکتا ہے۔ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی اور صیہونیت کے ساتھ ساتھ دوسری عالمی طاقت کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں فلسطین غزہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے قتل و غارت، ان پر تشدد اور ان کا نام و نشان مٹانے کی سازشیں پروان چڑھ رہی ہیں، ان نظموں میں اس کی مذمّت کے ساتھ ساتھ استغاثے، مناجات، شہر آشوب یا مرثیۂ مرگِ امتِ مسلم جو بھی منظوم کیا گیا ہے اس سب کو صنفِ نعت کی حقیقی روح کہا جا سکتا ہے۔ شرف الدین شامی اپنے شعروں میں یہی پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ عصرِ موجود کے مسائل اور المیے اگر کسی نعت گو شاعر کی نعت میں شامل نہیں تو یوں جانیے کہ وہ نعت کی روح سے واقف ہی نہیں اور وہ نعت گوئی کا حق ادا نہیں کر رہا۔

اس کتاب میں ان موضوعاتی نظموں کے علاوہ کچھ غزلیں اور نظمیں بھی مجموعی طور پر اسلامی دنیا کے حکمرانوں اور عوام کی بے عملی پر نوحہ کناں ہیں۔ وہ ''تحلیلِ مسجد'' کے عنوان سے ہندوستان میں بابری مسجد کے رام مندر

بنائے جانے کے تناظر میں بھی اظہار خیال کرتے ہوئے اسے مسجدِ اقصیٰ کے انہدام کی منصوبہ بندی کا ایک شاخسانہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ایودھیا کے حوالے سے اتنا یاد رہے
زمیں پہ مسجدِ اقصیٰ کے انہدام سے قبل
یہ اپنی سوڈ اسی واسطے کیا گیا ہے
مزاج دیکھ لیے جائیں اہلِ ایماں کے
اوراس طرح انہیں باور کرا دیا جائے
کہ انس وجاں سبھی صیدی ہیں نظمِ شیطاں کے

.....

ایک نظم ''از راہِ سخن'' میں وہ مشاعرے برپا کرنے والوں سے یوں شکوہ کناں ہیں گویا وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی صفوں پر بھی تنقید کر رہے ہیں :

برائے اہلِ فلسطیں کھلا پیام بھی ہو
مشاعرہ کوئی اہلِ غزہ کے نام بھی ہو
شکا گو میں جو مظالم کا دن مناتے ہو
تو حق میں اہلِ غزہ کے یہ التزام بھی ہو

.....

سچ یہ ہے کہ شرف الدین شامی کے تیور عام زندگی میں بھی اس صورت حال سے متاثر ہو کر شمشیر بکف انداز میں سراپا احتجاج اور آمادۂ جہاد جیسے محسوس ہوتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ وہ قلم کے محاذ پر کوئی آج سے نہیں ہمیشہ سے ڈٹے ہوئے ہیں اور وہ انفرادی حیثیت میں اجتماعی فرض ادا کر رہے ہیں جس کی ادائیگی ہم سب پر واجب ہے مگر ہم اسے کماحقہٗ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس جدو جہد اور قلمی جہاد پر انہی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

مرا محاذ قلم ہے سو میں محاذ پہ ہوں
قلم ہی میرا علَم ہے سو میں محاذ پہ ہوں

بلادِ شام ہوں، کشمیر ہو، غزہ کہ عراق
سبھی کا غم مرا غم ہے، سو میں محاذ پہ ہوں

.....

ان کی ان کرب و اندوہ میں ڈوبی ہوئی نظموں کے ساتھ ان کی کتاب کے پیش لفظ کے یہ انتہائی الفاظ بھی ہم سب کو گہری سوچ اور فکر کی دعوت دیتے ہیں جن پر یہ اظہار یہ تمام کیا جا رہا ہے:

''اہلِ اسلام کے تمام طبقات کو پوری دل جمعی اور تدبّر سے بلا تاخیر موثر کارروائی عمل میں لانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر اس معاملے میں ہم اب بھی تذبذب کا شکار رہے تو جان لیجیے کہ اس کرۂ ارض پر ہمارا حسّی اور معنوی وجود مٹ کر رہ جائے گا اور بطور ایک امتِ معمورہ کے خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں دونوں جہانوں میں ناکام و نامراد قرار نہ دے دیے جائیں۔

وما علینا اِلّا البلاغ المبین۔

حسرت موہانی اور اُن کا سرمایۂ اردو غزل

خاور اعجاز

حسرت کے مورث اعلیٰ نیشاپور سے التتمش کے زمانے میں قصبہ موہان آئے۔ حسرت کو اپنی نیشاپوری نسبت پر ناز تھا:

کیوں نہ ہوں اُردو میں ہم حسرت نظیری کی نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاک نیشاپور سے

.....

تعلیم مکمل کرتے ہی ۱۹۰۳ میں ''اُردوئے معلیٰ'' نامی پرچہ نکالا اور عملی سیاست میں قدم رکھا۔ حسرت کی زندگی جہدِ مسلسل اور طویل ذہنی و بدنی ریاضت سے عبارت ہے۔ وہ اصولوں کے پابند تھے اور آزادیٔ رائے پر بھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ کسی حد تک اُن کی شاعری میں مزاحمتی ادب کے آثار بھی موجود ہیں۔ یہ سب عناصر اُن کے ہاں انقلاب کی خواہش کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔

حسرت کی عملی زندگی میں جو بظاہر تضاد کی کیفیت ہے وہ دراصل سامراجیت دشمنی میں اُن کی مختلف پوزیشنیں لینے کے سبب نظر آتی ہے۔ انگریز سے نجات کے سلسلے میں وہ انڈین نیشنل کانگریس، کمیونسٹ پارٹی، تحریکِ خلافت اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں سے جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کا کندھے پر تھیلا لٹکائے تیسرے درجہ میں سفر کرنا مشہور ہے۔ یہ مثالیں اُن کی ذاتی خوبیوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

حسرت نے قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ یہ الگ بات کہ اُنھوں نے ہندوستان کے آئین پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے ترکہ سے ورثا میں تقسیم کے بعد بقیہ اُردو کی ترقی کے لیے پاکستان منتقل کرنے کی وصیت کی۔ جب وہ پہلی مرتبہ پاکستان آئے تو حکومت کی پیشکش کے باوجود سرکاری مہمان خانے کے بجائے بہار کالونی کے ایک پرانے مکان میں اِس لیے قیام کیا کہ حکومت زیرِ بار نہ ہو۔

سترہ برس کی عمر میں ۱۸۹۲ سے شاعری شروع کی۔ وہ کلاسیکی غزل کا آخری روشن ستارہ ہیں جنھوں نے روایتی غزل کو دم توڑتی ہوئی کیفیت سے باہر لا کر ایک بار پھر زندگی کے قریب کیا تاہم اُن کی غزل میں خطوطِ غالب کی طرح بے تکلف گفتگو والی انفرادیت ہونے کے باوجود تسلیم و نسیم اور داغ و امیر کی بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ اُن کے ہاں تغزل ہے لیکن تصوراتی نہیں بل کہ رندی اور سرمستی کے ساتھ حسیاتی تجربے جذبے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ وہ بے حد حساس اور رجائیت پسند تھے۔ انھیں نسوانی حسن کا جو تجربہ ہُوا اُسی کو بیان کیا اور محض ہوس پرستی کی روایت پر اکتفا نہیں کیا۔ کلام میں آسودگیِ عشق ہے، عشق کی نفسیاتی تجلیاں ہیں اور عشقِ مجازی کی گوناگوں کیفیات، لطافتِ بیان، رنگینیِ شوق، جوشِ بیان، طلسمِ خیالات، تخیل کی رفعت اور جذبات میں خلوص کے سبب وہ بیسویں صدی کی غزل کے نہایت اہم شاعر ہیں۔ ایسی ایسی تصویریں کھینچتے ہیں کہ مثال ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُن کی غزل میں آنے والی کل کے لیے ایک اُمید ملتی ہے جو اس عہد کی ٹوٹ پھوٹ میں بڑا مثبت روّیہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے امکانات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ نظریاتی شخص تھے مگر اُن کی غزل اُن کے سیاسی نظریات سے کافی حد تک پاک ہے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے قائل تھے اور غزل میں نظریات کے بجائے جذباتی حقیقت نگاری کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنے زمانے کے بہت مقبول شعرا میں شامل تھے۔ اُن کی غزل کسی فلسفے کی تابع نظر نہیں آتی بل کہ وہ انسان کی فطری خواہشات کی ترجمانی کرتے ہُوئے خیالات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے جن میں عشق و محبت سرِفہرست نظر آتے ہیں۔

حسرت محبت کے صرف دلدادہ ہی نہ تھے، اُنھوں نے اِس سے خلوص کے ساتھ توانائی اور سرمستی بھی حاصل کی اور گھٹن کی اُس کیفیت کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب رہے جس کا شکار اکثر شعرا ہو جاتے ہیں اور ہجر کی مایوسی اُن کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔ اُن کی زندگی اِتنی مصروف گذری جس نے انھیں ماورائیت کی طرف متوجہ ہونے کی فُرصت نہ دی اور اِسی فقدان کے سبب وہ پینسٹھ برس کی عمر میں بھی پریوں کی رعنائی پر مرمٹتے ہیں لیکن حسرت جیسی نیک نفسی دیگر شعرا میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُن کی نظر بازی میں خام نگاہی نہ تھی۔ عشق میں وہ تسکینِ بدن کے بجائے بالیدگیِ روح کے قائل تھے۔ حسرت کی زندگی میں ایک جگہ ٹھہر کر تجربے کو گہرائی سے ہمکنار کرنے کی نسبت ولولۂ عمل کے تحت آگے بڑھ

جانے کا رویہ موجود ہے جو اُنھیں زندگی، اُمید اور حوصلے سے جُڑا ہُوا شخص ظاہر کرتا ہے۔ حسرت کی عاشقانہ شاعری کا فرضی ہونا اُسی طرح قرار دیا جا سکتا ہے جیسے ریاض خیر آبادی کی مے نوشی۔ وہ انقلابی خیالات کے سیاسی آدمی تھے، مکمل آزادی پر یقین رکھنے والے۔ سیاست سے حسرت جیسی وابستگی اور قول و فعل کی ہم آہنگی شاید ہی کسی شاعر کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کے سیاسی اشعار میں بھی اُن کی شائستہ شخصیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ حسرت نے اگرچہ تصوف اور روحانیت کی فضا میں آنکھ کھولی لیکن اِس کے اثرات اُن کی شاعری پر زیادہ نظر نہیں آتے بل کہ کمیونزم سے دلچسپی کے تحت اُن کے نزدیک ''لا مذہبی بھی ایک مذہب ہے''۔ وہ نعتِ رسول کے ساتھ سری کشن اور گنگا دھر تلک سے بھی عقیدت رکھتے تھے، تاہم یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ اُنھوں نے زندگی شریعتِ محمدی کے تحت ہی گزاری۔

حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل کو کوچۂ تصنع سے نکالا، ماضی کی تلمیحات سے کنارہ کشی کا وصف سکھایا اور دربارِ سرکار کی خدمت میں حاضری سے نجات دلائی۔ غزل کو نکھار کر پختہ اور رچی ہُوئی روایت کے دھارے پر ڈالا اور آنے والے شعرا کے لیے نفاست، شائستگی اور سربلندی کے نئے رستوں کا تعین کیا۔ کسی فکری، فلسفیانہ یا نظریاتی دبستاں سے وابستگی کے بغیر اپنی افتادِ طبع کے سہارے سیدھی سادی جذبے والی شاعری کی تاہم جذبات نگاری میں بعض اوقات وہ اِس حد تک آگے نکل جاتے ہیں کہ کچھ ناقدین کی نظر میں فاسقانہ حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خود حسرت کے کلام میں جذبات نگاری اگر کہیں ہوس کی حدِ اعتدال سے گزر بھی گئی ہے تو یہ اُن کا عمومی رویّہ نہیں۔ اس کے برعکس ننھیال سے آنے والی تصوف کی لہر حسرت کو بھی چھو کے گزری ہے۔ حسرت ہی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے بارے میں حالی کی ''بے وقت کی راگنی'' جیسی رائے میں سے ''بے وقت'' کو منہا کر کے دکھایا اور ولی دکنی کے اِس دعویٰ کو ثابت کیا کہ راہ مضمونِ تازہ ابد تک کھلی ہے۔ غزل کا مزاج بدل کر اُس کو نئے زمانے کے مطابق ڈھالنے میں حسرت کا بڑا کردار ہے۔ وہ اگرچہ مجاز کے شاعر تھے لیکن اُنھوں نے حسن کے حقیقی خد و خال اُجاگر کیے اور ذات کے عمومی تجربوں کو زبان دے کر اجتماعی بنا دیا۔ اُن کی شاعری میں رقیب کی کارفرمائی شاید ہی کہیں نظر آئے۔ یہ امر اُن کے خارجی معاملات میں تو معاون ثابت ہُوا لیکن داخلی طور پر وہ محض نشاطیہ کیفیات کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئے۔ اُن کی طبیعت میں

گی لپٹی یا بنا سنوار کر کہنا شامل نہ تھا۔ وہ جو سوچتے اور صحیح سمجھتے تھے اُسے برملا بیان کر دیتے تھے۔ شاعری میں اُن کی اس خصوصیت کو بے تکلفی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بے باکی اُن کا خاصا تھی۔ مزید یہ کہ اُن کی سیاسی مصروفیات بھی کچھ کم نہ تھیں جس کی وجہ سے وہ ڈوب کر لکھنے کی فرصت مہیا نہ کر پائے۔ پھر وہ نوعمری سے ہی حسن پرست واقع ہوئے تھے اور قریباً بارہ برس کے سن میں ہی عشق و محبت کے تجربات سے گذر چکے تھے۔ ابتداً تو یہ ہلکے پھلکے مشغلے ہی رہے ہوں گے لیکن عالمِ شباب تک آتے آتے اُنھیں اِن کا لپکا لگ گیا تھا۔ اِنھی وجوہات کی بنا پر اُن کے ہاں عاشقانہ شاعری کا وہ رنگ نمایاں ہُوا جو کلاسیکی عاشقانہ شاعری سے بالکل الگ ہے اور جس کی خاصیت بقول حسرت سنتے ہی دل میں اُتر جانے کی ہے۔ سماجی روّیوں کی تبدیلی نے اگلے وقتوں کی محض بازاری عورتوں تک رسائی کو پردہ نشینوں کے پردے سے باہر آ جانے کے بعد بالمشافہ ملاقاتوں کی جو آسانی بتدریج پیدا کی اُس کا سراغ سب سے پہلے حسرت کی شاعری میں نمایاں ہُوا:

حسرت موہانی کے نمائندہ اشعار

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا مَیں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

اَب تو اُٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بارِ انتظار
کس طرح کاٹے کوئی لیل و نہارِ انتظار

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہُوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حُسن سے شوخی و اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہُوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

تھی راحت حیرت کی کس درجہ فراوانی
مَیں نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

☆☆☆☆☆

بیدی کا بھیدی

راجندر سنگھ بیدی اپنے معاصرین میں اس لیے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے مدت العمر معیار پر سمجھوتا نہیں کیا۔ ان کے ہاں مقدار غیر معمولی نہ سہی لیکن ان کے ہاں کرشن چندر اور منٹو کی طرح بھرتی کی کہانیاں قطعاً نہیں ملتیں - بیدی کے افسانے کی اساس 'جذبہ' ہے بل کہ جذبے کی صداقت کہیے۔ اس لیے ان کے فکشن میں فکری کلیشے یا کتابی باتیں نہ ہونے کے برابر ملیں گی۔ ایک ہڈ بیتی کا احساس قاری پر مسلسل اپنا تاثر قائم کیے رکھتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے زندگی تخلیق کرنے پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مسلک تھا: 'انسان کی ذات ہی سے خدائی کے کھیل ہیں ___ بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں!' اگرچہ بعد میں بشر مرکزیت خاص توانائی کے ساتھ سوال زد بھی ہوئی مگر بیدی کے افسانے کی بنیاد ہی انسان ہے۔ کردار اساس افسانہ نگاری میں وہ اپنا مثیل نہیں رکھتے۔

بیدی کو افسانہ نگار کی نہایت تیز آنکھ میسر تھی جو اعماق تلک بسہولت اتر جانے کی خوگر رہی - وہ احساس اور مشاہدے کا ایسا فنکارانہ امتزاج بناتے ہیں جو اعلا انفرادیت اپنے نام کر کے رہتا ہے۔ یوں ان کا تتبع بھی سہل نہ رہا۔ ہر بڑا فنکار اتباع کی حیران کن ترغیب رکھتا آیا ہے لیکن عملی طور پر اس کی پیروی ہو نہیں پاتی۔ بیدی جیون سے کہانی اٹھانے میں تو کمال رکھتے ہی تھے، تراش کے بھی وہ امام ٹھہرے۔ وہ ایک تحنک افسانہ نگار تھے۔ اساطیر کو اپنے عصر تک لے آنے میں جیسی کامرانی ان کے حصے میں آئی، کسی اور کو یہ اختصاص نہ مل سکا۔ یوں ان کے ہاں وقوعہ مفرد نہیں رہتا، روایت کے تسلسل میں مرکب ہو جاتا ہے۔ کسی ایک افسانے کو محور میں لا کر مثبت منفی

جمیل احمد عدیل

تاثر وضع کرنا تنقید میں ایسا مستحسن عمل نہیں سمجھا گیا۔ اسی لیے رام لعل کی 'میتھن' پر نکتہ چینی پذیرائی نہیں پا سکی۔ علاوہ ازیں بیدی غلام عباس کی مانند 'سراپا انتخاب' تھے۔ کم لکھا مگر جو پیش کیا، وہ چنیدہ! بیدی کا بالخصوص اس لیے بھی اعتراف کیا گیا کہ یہ تخلیق کار زیست کے زہر پرشا کی ہو کر نہ رہ گیا بل کہ اس کی جوہری معنویت کو گہرے تناظر میں دیکھنے/ دکھانے کی سعی کو اپنے لیے بامراد بنا گیا۔ معیار کے لحاظ سے راجندر سنگھ بیدی کے تمام افسانے اہم قرار پائیں گے۔ تاہم: لاجونتی، ایک باپ بکاؤ ہے، گرم کوٹ، بولو، جوگیا، اپنے دکھ مجھے دے دو، صرف ایک سگریٹ، بے کار خدا، دس منٹ بارش میں۔۔ کی مقبولیت زبان زد عام چلی آ رہی ہے۔

بیدی یوں بار دگر یاد آئے کہ مشتاق احمد کی مختصر مگر مؤثر تصنیف: 'بھگوان انسان بنانے سے ابھی تھکا نہیں ____ بیدی: زندگی اور کہانی' ____ ان دنوں مطالعے کا حصہ بنی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب تنقید کی بجائے بیدی کے جوار میں آباد ہو کر لکھنا چاہی جس میں وہ ظفریاب رہے۔ فی الاصل بیدی کی قرات تربیت یافتہ ذوق کی متقاضی ہے۔ منٹو کا متن از خود قاری پہ اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے۔ کرشن چندر کا رومان خواندہ کو کلاوے میں بھر ہی لیتا رہا۔ عصمت چغتائی کی نمکو بل کہ مرچیلی نثر مساکیت کی غذا بننے پر قادر ٹھہری۔ غلام عباس کے موضوعات اور اسلوب کی روانی پڑھنے والے میں مزاحمت کا عنصر پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔ اپنے ان ہم عصروں میں واحد بیدی ہیں جن کی پڑھت حواس کی مکمل بیداری اور پورے وجود کی شمولیت پر اصرار کرتی ہے۔ گزشتہ خواندگی کی صفت اس پر مستزاد! اگر بیدی کو نسبتاً کم قارئین میسر آئے تو اسے ان کے سرفراز افسانہ نگار ہونے پر برہان جانیے۔

جنھیں راجندر سنگھ بیدی کے فکشن سے کیف کا رشتہ استوار کرنا ہے، وہ بیدی سے ایک بار مل لیں تو یہ قرب بیدی شناسی میں معاون ثابت ہو گا۔ زیر جائزہ تالیف کا پہلا باب بیدی کی رسمی سوانح کا پیش کار نہیں بل کہ ان کی اس ذات کا تعارف ہے جو عمر بھر شدت احساس اور دکھ میں جذب رہی۔ جس نے قریباً ساری حیات محزون ہو کر بتائی ہو، وہ طرب کا نہیں کرب ہی کا ترجمان ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف احوال بیدی کی کھوج میں نکلے تو وہ تمام حوالے ڈھونڈ لائے جن میں یہ عظیم افسانہ نگار مبتلائے ایذا دکھائی دیتا ہے۔ قدرت چاہتی تو ایک مرفع الحال شخص کو بھی غموں کی ترجمانی پر مامور کر سکتی تھی لیکن اس نے درد آشناؤں ہی کو رنج و

محن کی ترقیم کا اعزاز بخشا۔ 'سفر حیات و حاصل حیات' سے معنون ان صفحات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بیدی کی تحریر کو تاثیر کا ارمغان اسی لیے نصیب ہوا کہ انھیں دوستوئیفسکی کی طرح ہر آن کے ستم کو الگ سے بھگتنا پڑا۔

والدین سے مناسب رفاقت پر مشتمل زمانہ نہ ملا؛ اوائل عمری میں تاہل اور غم روزگار؛ ملازمت ملی بھی تو ڈاک خانے میں کلرکی؛ بے شمار لفافوں پر مہریں ثبت کرتے چلے جانا بیدی کے مزاج سے مطابقت بھی کہاں رکھتا تھا! کئی سال وہ چکی کی اس مشقت کا شکار رہے۔ مصنف، کنہیالال کپور کو Quote کرتے ہوئے بتاتے ہیں: ''میں نے دیکھا کہ ایک کھڑکی کے پیچھے راجندر سنگھ بیدی بیٹھا ہوا بجلی کی سی تیزی سے خطوط اور لفافوں پر مہریں لگا رہا ہے--- اس کے بیشتر احباب کف افسوس ملتے رہے کہ قدرت نے اس کے ساتھ کتنا خوف ناک مذاق کیا ہے۔'' اس اعصاب شکن نوکری کے صلے یعنی اذیت ناک تھکن پر خود بیدی بھی نالاں رہتے تھے کہ جب گھر لوٹتے تو لکھنے پڑھنے کی سکت سے ان کا وجود عاری ہوتا تھا۔ اس کے باوصف وہ نیم شب تک اپنے شوق سے جڑت قائم رکھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی غمگسار اہلیہ کو کہتی کہ سو جاؤ، آرام کرو، کیا رکھا ہے کاغذ خراب کرنے میں ___ لیکن انھیں ایک آرٹسٹ کی والہانہ وابستگی سے نوازا گیا تھا، یوں وہ تکلیف جھیل گئے مگر دل شکستہ نہیں ہوئے۔ لکھنا تو جیسے ان کا عشق طے ہو گیا تھا۔

جب عاجز آ کر مذکورہ چاکری کا قلادہ اتار پھینکا تو تقسیم کے فسادات کی افتاد قریب آن پہنچی۔ نسبت روڈ پر انھوں نے 'سنگم پبلشرز' کے بینر سے جو اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا، ایماں کی حرارت والے بلوائیوں نے پھونک ڈالا۔[1] بیدی لاہور ہی رہ جانے کی تمنا سے دستبردار ہو گئے، یوں ماڈل ٹاؤن والے گھر کو خیرباد کہہ کر ہجرت کر گئے۔ پے در پے آشوب سہتے سہتے بیدی کا رقیق القلب ہو جانا سمجھ میں آتا ہے:

ایک عمر رسیدہ شخص ان کے پاس آ کر کہنے لگا کہ ان کے لڑکے کی حالت بہت خراب ہے وہ انھیں پیسوں کی جگہ دوائیں دلوا دیں۔ بیدی نے کار نکالی اور دوائیں خرید کر اس شخص کے حوالے کیں اور واپسی پر گاڑی کنارے لگا کر رونے لگے کیونکہ جس مرض کی دوائیں انھوں نے اس شخص کو خرید کر دیں، ان کے والد کی موت بھی اسی مرض کے سبب ہوئی تھی۔ (ص:۲۴)

مصنف نے بیدی کے حالات زندگی کا ان کے فن پر اثر دریافت کر کے اپنے مطالعے کو

الگ جہت دینا چاہی ہے۔ بیدی اگر اپنا افسانہ پڑھتے/سناتے ہوئے بے اختیار گریہ کناں ہو جاتے تھے تو ان کی کہانیاں بھی آنسوؤں میں گوندھ کر لکھی گئی تھیں۔ زندگی کے المیے بیدی کو اپنے اور کھینچتے رہے، وہ بھی انھیں سے ماجرے سینچتے رہے۔ یہاں یہ توضیح ضروری جانیے کہ بیدی کی ذاتی رقت اپنی جگہ لیکن ان کے متون اعلانیہ عزاداری کا تاثر نہیں رکھتے۔ واقعات، کرداروں، فضا میں سوگ بالائی سطحوں پر نہیں تیرتا۔ یہ صدمے، آزار، مصائب اور ہموم سرگزشت کی رگوں میں اترے ہوئے ہیں۔ یوں وہ سوز کی تہوں میں موجود کیفیات کے ترجمان تھے۔ رنجیدگی کی تہذیب سے آگاہ تھے۔ جسے 'ہوک' کہتے ہیں، وہ اس گداز سے واقف تھے۔ اس لیے انھیں عرفی معنوں میں 'جذبات نویس' نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح راشد الخیری یا خواجہ حسن نظامی تھے۔ مجتبیٰ حسین کے تاثر کو نقل کر کے بیدی کی اصل روح تک پہنچنے کی صحیح کوشش کی گئی ہے کہ ان کی ذات چھٹپٹے کا وقت تھی۔ ہر دم چمکتا آفتاب، ہر لحظہ ہلکی سی پھوار۔ یوں جذبوں کی سرحد پر رقصاں رہنا۔ راجندر سنگھ بیدی اپنے تخلیقی مزاج کے اعتبار سے ایک Perfectionist تھے۔ یہ رجحان بھی ان کی حساسیت ہی کا آئینہ دار قرار پائے گا۔ وہ اپنی زود حسی سے انکاری نہیں تھے بل کہ افسانہ نگاری کے لیے اسے لازمی عنصر یقین کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ عصبی بیماری کے باعث ملنے والی نازک مزاجی یا Sensitivity کو بھی نعمت سمجھتے تھے۔ یہ ذکی الحس ہونا ان کی طاقت بنا جیسے منیر نیازی کے لیے (بقول خود) خوف شکستی کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ اس ضمن میں مصنف نے بیدی کا موقف پیش کیا ہے: ''اگر ہیمنگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟'' وہ واقعی بڑھئی کی طرح کہانی کی چولیں کسنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو فن کی معروضی تعیین ہوا کرتی ہے۔ بیدی ہی کے ہم عصر کرشن چندر کی مقدار کو ہسار برابر قرار پائے گی۔ ان کے متعلق ممتاز شیریں کا کہنا کتنا درست نکلا: وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پر قبول کرتے ہیں۔۔ چنانچہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کو تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں جسے Agony Creative کہتے ہیں۔'' بیدی ان سے بالکل دوسرے قطب پر واقع ہوئے تھے۔ تخلیق کی سنوار کو انھوں نے حرز جاں بنا لیا۔ یہی جانکاہی ان کے اعصاب کو

چھلنی کر گئی۔ یوں ان کی زندگی کے آخری چھے برس مفلوج شخص کے طور پر بیتے اور وہ مزید لکھنے کی حسرت لیے دنیا سے روانہ ہو گئے!!

کتاب کا دوسرا باب بیدی کے کرداروں کو موضوع بناتا ہے۔ اگرچہ مصنف نے اس مطالعے کو مفصل نہیں بنایا لیکن افسانہ نگار کے چنیدہ کردار اپنے مسائل سمیت یہاں بیان ہو گئے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے --- یہ سب بیدی کی کہانیوں میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے تاہم یہ افراد زیادہ تر لوئر مڈل کلاس سے متعلق ہیں۔ ناداری بجائے خود ایک المیہ ٹھہری اور المیہ ہی فکشن میں ترجیحاً جذب ہوتا آیا۔ بیدی کی دردمندی بھلا زندگی کے کرب سے کب فاصلہ اختیار کر سکتی تھی! یوں ان کے مشاہدے نے نچلے طبقے ہی کو تخلیقی اظہار کے لیے چنا۔ غربت و فلاکت نے غالباً کبھی ماضی نہیں ہونا اس لیے مفلسی کے دکھوں کو پیش کرتی کتھائیں بھی کہنگی کا شکار نہیں ہوں گی۔ البتہ آرٹ کے تقاضے بطور شرط موجود رہیں گے:

"بیدی کے کردار ان کی کہانی میں گندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کردار اپنی کہانی سے الگ ہو کر کہیں نہیں ابھرتے اور کہانی اپنے کرداروں کو پس پشت ڈال کر کہیں سامنے نہیں آتی۔" مصنف نے اسی لیے ایک پختہ کار افسانہ نگار کے کام کو اپنے براہین کے ذریعے مزید تعیین قدر سے گزارا ہے۔

بیدی نے غالباً بچوں کے لیے تو نہیں لکھا مگر بچے ان کے افسانوں کا موضوع ضرور بنے ہیں۔ اپنے کامل فطری سبھاؤ کے ساتھ۔ مصنف نے اس مناسبت سے 'بھولا' نامی کردار کا قدرے تفصیلی اور ذہانت آمیز تجزیہ رقم کیا ہے۔ اس طرح یہ کردار اپنی فطری نفسیات لیے قاری پر از سرِ نو منکشف ہوتا ہے۔ 'بابئی' ___ یہ کردار بھی اگرچہ ایک بچے کا ہے لیکن بپتی کے اعتبار سے اسے گمبھیر قرار دیا جانا چاہیے کہ یہ صرف عہدِ طفولیت کی تصاویر نہیں دکھاتا بلکہ طبقاتی اونچ نیچ کے بے رحم اثرات کا مظہر بنتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ماحول کے نقوش کا ارتسام جیسے ایک بچے کے ذہن کی ساخت ہی کو بدل ڈالتا ہے۔ یہ طرف بیدی کے ماہر نباض ہونے پر دال ہے کہ انھوں نے ماحول کے فرق سے ایک بچے کو متاثر ہوتے ہوئے یوں دکھایا ہے کہ وہ معصومیت میں اپنی اصلی سماجی حیثیت کو فراموش کر بیٹھا۔ بچے تو اپنی جگہ اگر کسی عامی شامی کو بھی عارضی سطح پر امارت کی چکاچوندھ میسر آ جائے تو وہ اپنی کھال میں واپس نہیں آ پاتا۔ مصنف نے اس کا ایک سبب احساسِ محرومی کو ٹھہرایا ہے۔ یعنی محرومی اور احساسِ محرومی

میں تفاوت ہی دراصل قیامت برپا کرتا ہے۔ بابو کے ذہنی بگاڑ کا سبب بھی یہی پہلو بنا کہ وہ اصلاً Deprivation میں مبتلا تھا: ''اگر امیر زادوں کے ساتھ رہ کر اس کی عادات بگڑ گئیں، وہ ماں باپ کو حقارت آمیز لفظوں سے پکارنے لگا، آواز میں رعونت بھر آئی، جوتوں سمیت چوکے میں چلا جاتا، دودھ کے ساتھ بالائی نہ کھاتا۔'' مصنف کی نگاہ میں بیدی Edged Double سے موسوم حربے کے تحت دونوں طبقوں کو ہدف طنز بنا رہے ہیں۔

ببل کے کردار کو بھی کہانی کے پورے متن میں دیکھا گیا ہے۔ بچوں سے وابستہ مصنف کے یہ کرداری تجزیے اس لیے اہم قرار پائیں گے کہ انھوں نے افسانی متون کو سامنے رکھتے ہوئے مکمل ماجروں میں طفلی کرداروں کے افعال و اعمال کو پرکھا ہے۔ بیدی کا فن بھی یہی تقاضا کرتا تھا کیونکہ وہ کہانی کی کلیت کے قائل تھے۔

نسوانی کرداروں کے تعلق میں: شمی، ہولی، لاجونتی، اندو--- مردوں میں: رحمان، زینو، سعادت، پولہو رام--- تنقیدی تعینات کا حصہ بنے ہیں۔ یہاں بھی ان کرداروں کی نفسیات کو کہانی کے مجموعی واقعاتی دھارے میں سمجھنے سمجھانے کی کاوش نمایاں نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ قصہ اپنی اکائیت پر مصر ایک تخلیقی صداقت ہے۔ وحدت اگر مجروح نہ ہو تو کثرت سے اسے کوئی عداوت نہیں۔ اجزائے افسانہ کا متن میں تمام انجذاب ہی سالمیت کا نقش کہلا پائے گا۔ یہی اجتماع جزو کل کی حیات کا ضامن بنے گا۔ سو، یہ طے ہے کردار اگر باغی اکائی بن کر ظہور پہ ضد کرتا ہوا دکھائی دے تو اسے افسانہ نگار کی شکست سے عبارت کرنا ایسا غلط نہ ہوگا۔ بیدی کے کردار مجموعی بیتی میں پورے جذب ہیں۔ یوں مصنف نے انھیں کہانی سے اچک کر پیش نہیں کیا۔ داستان کے تسلسل میں ان کی حرکات و سکنات کے معانی جاننے کی کوشش کی ہے۔ البتہ انھیں یہ خوب درک ہے کہ کردار کی تراش یا پیش کش سے افسانہ نگار اپنی استعداد ثابت کر پاتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے ہنر سے سپاٹ (Flat) کردار کو بھی پہلودار (Round) بنا دیتا ہے۔ ہر چند یہ کرشمہ زائی ایسی سہل نہیں۔ ترابی طائر میں روح پھونک کر اسے محو پرواز کر دینا، ایک اعجاز! ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے موزوں نتیجہ اخذ کیا ہے:

ایک عام سے کردار کی تخلیق جس میں پہلو داری نہ ہو یا دلچسپی کے عناصر نہ ہوں، اور جو ہمیں تحیر میں مبتلا نہ کرتا ہو۔ خواہ اپنے عمل سے، مکالموں سے، دوسرے کرداروں سے اپنے ارتباط سے یا (فکشن) پر اپنے مکمل

وجود کے غلبے اور انجام سے، تب وہ فکشن سے باہر کی چیز ہے۔(۲)

یعنی جب خواننده بجز بشر کوئی اور نہیں تو اس سے زیادہ اپنے ہم جنس میں کون دلچسپی لے گا___ انسان انسان کا آئینہ ٹھہرا ___ قاری کے دل میں چاہے کسی افسانی کردار کے لیے محبت پیدا ہو، چاہے نفرت___ ہر صورت میں وہ اسے اپنی ذات سے منہا کر کے دیکھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ ہر مذکور مانس کا اپنے ساتھ موازنہ کرتا چلا جائے گا؛ کبھی خفی، کبھی جلی! کبھی وہ کسی کردار کے عبرت ناک انجام پر شکر ادا کرے گا کہ یہ وہ نہیں ہے؛ کبھی وہ اس کے کارناموں پر رشک کرے گا؛ کاش یہ وہ ہوتا!

''بیدی: زندگی اور کہانی'' کے مصنف جہاں افسانے کی شعریات سے آگہی رکھتے ہیں وہاں کردار سے وابستہ حرکیات بھی ان کے حیطۂ ادراک میں آباد ہیں۔ اس لیے وہ بیدی کے تخلیق کردہ کثیر الجہات کرداروں کے پرت عمدگی سے کھولنے میں کامیاب رہے ہیں:

بیدی کے کردار منفرد اور حقیقی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں - انھوں نے اپنے کرداروں کو مافوق الفطرت اور خلا میں معلق ہونے سے بچایا--- بیدی کے کردار جھوٹ بول کر اور مبالغہ آرائی سے رنگینی پیدا کرنے کے بجائے زندگی کی حقیقتوں اور سماجی نشیب و فراز کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے واقعات کے بیان میں نفسیاتی گرفت مضبوط رکھی - کرداروں کے مکالمے نہایت فطری ہیں --- بیدی نے کرداروں کی کھونٹیوں پر واقعات لٹکانے کی کوشش کی ہے نہ ہی واقعات کی سرزمینوں میں کرداروں کے کھمبے گاڑنے کی مشقت۔ (ص:۶۲)

'بیدی کے آٹھ رنگ' سے موسوم تیسرے باب میں راجندر سنگھ بیدی کے درج ذیل افسانوں کے تجزیے رقم کیے گئے ہیں:

- لاجونتی
- گرم کوٹ
- ایک عورت
- قلم دان
- دوسرا کنارہ
- سارگام کے بھوکے
- جوگیا
- لمبی لڑکی

چون (۵۴) صفحات پر مشتمل یہ باب اس کتاب کا سب سے جاندار جزو ہے۔ فکشن کا فہم یہاں متکلم ملے گا۔ حقیقت یہ ہے ان باثروت تجزیوں ہی کی وجہ سے اس تاثر کو 'بیدی کا بھیدی' سے معنون کیا گیا تھا۔ جیسا

کہ مصنف خود معترف ہیں، بیدی اس لحاظ سے بے مثال ہیں، ان کا ہر افسانہ اپنے نام AnalysisExclusive کرنے میں کامیاب رہا۔ جب اتنے اہم نقاد تجزیات لکھ چکے ہوں تو مزید بات کرنے کی گنجائش قدرے سمٹ جاتی ہے لیکن یہ بیدی کی تخلیقی عظمت ٹھہرے گی کہ ان کے متون ہر پڑھت پر نئے معانی دان کرتے ہیں۔ سو، ان آٹھ افسانوں کی خواندگی مطالب کی مختلف اکناف سامنے لانے میں بامراد رہی کیونکہ نقاد نے کافی باریک بینی سے ٹیکسٹ کا مطالعہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں تحقیقی ضابطوں کے مطابق سابقہ مطالعات سے استفادہ کرنے سے بھی یہ حصہ Comprehensive ہو گیا ہے۔ یہاں الگ الگ ہر تجزیے کی مناسبت سے استحسان کو موثر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔

'ایک چادر میلی سی' ___ راجندر سنگھ کا واحد ناول[۳] ٹھہرا۔ یہ فکشن پارہ بھی بیدی کی مہر سے معتبر ہوا۔ مصنف نے بڑی مہارت کے ساتھ اس کی تلخیص تیار کی ہے۔ جسے پڑھ کر قاری مکمل کہانی سے آگاہ ہو جائے گا۔ طویل مباحث چھیڑنے کے بجائے ایجاز و اختصار کا گر آزماتے ہوئے کم و بیش ہر نکتہ اس جامع تحریر میں آ گیا ہے۔

بالخصوص پنجاب کی دیہی زندگی نے اردو فکشن کو مالدار کیا ہے۔ بیدی بھی اپنے اس شاہکار کے ساتھ حصہ دار ہوئے۔ گاؤں کا ناخواندہ سماج اپنی رہتل کا اوریجنل نقش لیے اس ناول میں پوری قوت کے ساتھ متحرک ملے گا۔ راست ماجرے پر مبنی کوئی فکشن ایسے گہرے اثر سے متمول ہو سکتا ہے، امثلہ کافی کم ہی ملیں گی:

ساٹھ سال[۴] کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کہانی اپنی پائیداری و پائندگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جس کی وجہ موضوعاتی و اسلوبیاتی سطح پر عائد کی جانے والی وہ ذمہ داریاں ہیں جنھیں بیدی 'ایک چادر میلی سی' میں نبھانے میں کامیاب ہوئے۔ (ص:۱۲۴)

کبیری کردار رانی/رانو سمیت دیہاتی عورتوں کا ثقافتی روپ یہاں اپنی اصلیت کے ساتھ دکھائی دے گا: ''بیدی نے عورت کی محرومی اور مرد کے جبر کی تفریق کو کھل کر بیان کیا ہے۔'' افسانہ مبالغے کی راہ میں زیادہ مزاحم نہیں ہوتا کہ قاری سدا فسوں کا طالب رہا۔ اس کے باوجود ہر مبالغے کو منہا کر کے ایسا قصہ لکھنا جو ہر رخ سے واقعیت پر مبنی ہو، حقیقت آفریں ہو، بہت دشوار! بیدی کا یہی طغرائے امتیاز یہاں اور بھی نمایاں ہوا: ''سماج 'جیسا ہونا چاہیے' کے بجائے بیدی نے 'جیسا وہ ہے' کے تصور کی

پاسداری کی۔'' تخیل کی جادوگری اپنی جگہ لیکن فکشن رائٹر کا ایک امتیاز یہ کہیے کہ وہ اپنے اُس مشاہدے کی تائید چاہتا ہے، جس کے بے شمار گواہ ہوں لیکن ان پر یہ انکشاف پہلی مرتبہ زیر قرأت متن کے ذریعے ہو___ سو، معلوم ہونا اور واقعہ ہے، معلوم کا ادراک میسر ہونا الگ صورت حال قرار پائے گی___ بیدی اسی اکتشاف کی ثروت سے مالا مال ہے۔ اس باب کے آخر میں ناول کے تکنیکی پہلو اجمال کے ساتھ رقم ہوئے ہیں۔ تاہم ناول نگار کے اسلوب کی مناسبت سے بسیط تجزیہ تحریر کیا گیا ہے۔ سبک کا طلسم شامل ہو کر ہی فکشن متن متوجہ کر پاتا ہے۔ اگرچہ اس تعلق میں بعض جہتیں اب پارینہ ہو چکیں لیکن بیدی کے ساتھ ان کا اختصاص بہر طور قائم رہے گا۔

راجندر سنگھ بیدی ایسے نابغہ پر مستقل تصنیف بجائے خود قابل ذکر بات ہے۔ سو، مشتاق احمد کے کریڈٹ پر یہ کتاب ان کا حوالہ بنی رہے گی۔ 'ہر چہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر!' کی مثال اس پوسٹک کو بیدیات کے شیلف میں حسب مقام جگہ ضرور ملے گی کہ لگن/ دھیان اور انسلاک اور شیفتگی کے ساتھ قاری اور بیدی کے مابین تازہ سنگت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس تالیف میں تنقید و تحقیق کے رائج صراحتی اور سلیس طرز نگارش ہی کو اپنایا گیا ہے لیکن توقع ہے پڑھتے ہوئے کہیں بے کیفی (Tedium) کا احساس دامن گیر نہیں ہوگا۔

حواشی

(۱) ایک اعلا ظرف انسان منتقمانہ جذبات کو دبانے میں فتح مند ہو جاتا ہے۔ بیدی نے بھی ردعمل کے سم کو پنپنے نہ دیا۔ بھارت نقل مکانی کے بعد انھوں نے مسلموں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کا مظاہرہ کیا۔ ان کے والد کی نصیحت بھی یہی تھی کہ تمام مذاہب مساوی ہیں اور ان کا درست منتہا پرماتما سے اتصال ہے___ اسی باب میں ہربنس سنگھ کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ جب ان کے سامنے فسادی ایک مسلم کو قتل کرنے ہی والے تھے تو بیدی نے اپنے بھائی کی معیت میں اس کی جان بچائی، گھر لے کر آئے، کھلایا پلایا اور بحفاظت روانہ کیا۔

(۲) اردو ناول: کرداروں کا حیرت کدہ/ص: ۱۰

(۳) بعض نقاد اسے ناولٹ بھی قرار دیتے ہیں - مصنف کو چاہیے تھا اس اختلاف کی نسبت سے بھی نوٹ اپنی کتاب میں شامل کرتے۔

(۴) اب چھیاسٹھ برس۔

☆☆☆☆☆

''فرمودات عامری''

مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر عامر سہیل میرے دوست ہیں کہ نہیں۔ اور اگر ہیں تو دوستی کتنے درجے پر ہے۔ یہ تو شاید ڈاکٹر صاحب بھی فی الحال بتانے سے قاصر ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ ہماری ابھی تک کوئی ایک ساتھ سیلفی بھی سامنے نہیں آئی۔ چہروں کے ایمپریشن، بیٹھنے کا انداز اور لوکیشن کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی چیخ چیخ کے بہت کچھ کا پتہ دے رہے ہوتے ہیں اور یہ کوئی معمولی وجہ نہیں۔ اب تو ان کی کچھ سیلفیاں ایسی بھی آ رہی ہیں جن پر مجھے باقاعدہ رشک آتا ہے۔ کاش ان کے بجائے تصویر میں موجود دوسری ہستی کے ساتھ میں ہوتا۔

عامر سہیل صاحب پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں، مگر ان کے پاس بیٹھ کر بات کیجیے تو آدمی کو فوراً یقین نہیں آتا کہ یہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ الٹا یوں لگتا ہے جیسے کسی پرانے تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی محفل میں بیٹھے ہوں۔ جو مریض کی کتنی ہی پیچیدہ اور مزمن بیماری کیوں نہ ہو۔ پہلے نہایت اطمینان سے مسکراتا ہے۔ پھر دو چار میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے اور آخر میں ایسی نرم سی ''باتوں کی گولی'' دے دیتا ہے کہ مریض کو خود ہی لگنے لگتا ہے کہ اب طبیعت سنبھلنے والی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میرا تعلق کئی دہائیوں پر مشتمل ہے۔ بقول ڈاکٹر صاحب اسے روحانی ادبی تعلق سمجھا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک پھر بھی کچھ نہ کچھ قدریں مشترک تو ہونی چاہئیں۔ ایک دن یہ گتھی بھی ڈاکٹر عادل سعید صاحب نے سلجھائی۔ میں نے ان سے پوچھا۔

''عادل صاحب آپ جانتے ہیں کہ میں ان دنوں مسلسل نثری نظم لکھ رہا ہوں۔ مجھے

سعید اشعر

لگتا ہے ہزارہ میں، میں اکیلا ہی اس صنف کا حمایتی ہوں۔''

ڈاکٹر عادل سعید کے جواب نے مجھے سرشار کر دیا۔

''ایسا نہیں۔ ڈاکٹر عامر سہیل بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔''

اگلے روز میں نے ڈاکٹر عامر کو میسج بھیج دیا۔

''خاکے، آزاد نظم، غزلیں، نثری نظم اور دوہے، آئندہ ان اصناف میں میری کتابیں آ رہی ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان میں سے آپ نے کس کتاب پر مضمون لکھنا ہے۔''

چھ منٹ بعد ہی جواب آ گیا۔

''خاکوں والی کتاب اور نثری نظم والی۔۔۔''

میں نے ان کو پہلی بار کب اور کہاں دیکھا یاد نہیں۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے وہ اس وقت بھی ایسے ہی خوش طبع، خوش شکل اور خوش لباس تھے جیسے اب ہیں۔ چہرے پر مسکان سجائے دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ میں نے آج تک انھیں کسی سے الجھتے نہیں دیکھا۔ کسی کی غیبت بھی کر رہے ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اسے مس کرنے کی وجہ سے یاد کر رہے ہیں۔

بظاہر یہ معصوم دکھنے والے آہو صفت ڈاکٹر صاحب دیکھنے والے کو اس مغالطے میں مبتلا کر سکتے ہیں کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت شملہ پہاڑی کے دامن میں قلانچیں بھرنے میں گزار دیتے ہوں گے۔ ایسا بالکل بھی نہیں۔ وہ شروع دن سے اپنا بیشتر وقت ادب کے میدان میں نیٹ پریکٹس میں گزارتے رہے ہیں۔ اسی کی دہائی میں ابھی وہ کالج میں ہی تھے جب انھوں نے ''فنون'' کے وسیع و عریض گراؤنڈ پر چوکے اور چھکے مارنے شروع کر دیے تھے۔ فنون اس وقت پاک و ہند کا صفِ اول کا ایک ادبی مجلہ تھا۔ ہر چھوٹے بڑے ادیب کو پروفیسر محمد ارشاد کے آنے والے مقالے کا انتظار ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اختلافات کے حصے میں مشاہیر کے مقالات پر ہونے والی بحث میں نہ صرف باقاعدگی کے ساتھ حصہ لیتے بل کہ کھل کے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار بھی کرتے۔ خود کو گرگِ باراں دیدہ سمجھنے والے ہمارے ہاں کے بیشتر ادیب اس وقت چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھانے میں مصروف تھے۔ جو اس قابل بھی نہ ہوتا وہ پدرم سلطان بود کا نعرہ لگا کے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی سعیِ لاحاصل میں جتا رہتا۔

ڈاکٹر صاحب نے کنویں کا مینڈک بننے کے بجائے اپنے لیے کھلے سمندر کا انتخاب کیا۔ اس کے لیے جدید آلات سے آراستہ

ایک مضبوط سفینے کی ضرورت تھی۔ کاغذ کی کشتی تو شاعری میں ہی اچھی لگتی ہے۔ دن کو رات اور رات کو دن کرتے ہوئے رجھ کے مطالعہ کیا۔ فلسفہ، ادب، تاریخ، نفسیات، معاشرتی علوم الغرض کچھ نہیں چھوڑا۔ پھر ادب میں جدید و قدیم، نثر و نظم، تنقید و تحقیق، مشرق و مغرب سب کچھ سمیٹتے چلے گئے۔ یعنی اپنے آپ کو تمام ہتھیاروں سے لیس کر لیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن بدخواہوں کا منہ بند کرنے کے لیے پی ایچ ڈی بھی کر لی۔ تاکہ ان کا فرمایا ہوا سند رہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے ان کے تھیسز کا عنوان تھا۔

''جدید لسانیاتی اور اسلوبیاتی تصورات۔''

ایسے جناتی قسم کے موضوعات کو دیکھ کے میرے جیسا کمزور دل بندہ دور سے ہی اپنے ہاتھ کھڑے کر لیتا ہے۔ یہ تھیسز اب کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی بعض ماٹھے تنقید نگار ادھ موئے ہو جاتے ہوں گے۔ لیکن شاباش ہے ڈاکٹر صاحب کو انھوں نے یہ حرز جاں بنانے کے بجائے جزو جاں بنا کے رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے سنگلاخ موضوعات پر ان کا قلم ہلکورے لیتی ہوئی ندیا کی طرح چلتا ہے۔

ان کا قاری تھوڑی دیر کے لیے ارد گرد بکھرے اختلافات کے نوکیلے سنگریزوں اور دیو نما نظریاتی چٹانوں میں گھرنے کے بجائے پانی کی شفاف موجوں کا ہمرکاب رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر بشاشت اور سلاست سے مملو ہے۔ یہاں آمد و آورد کا کھیل نہیں۔ کوئی جادو ہے ہپناٹزم ہے یا الہام۔ جو بھی ہے کچھ ہٹ کے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں تاثیر ہے۔ میرے جیسا حلیہ بنا لیں تو لوگ جوق در جوق بیعت کے لیے حاضر ہونے شروع ہو جائیں۔

مندرجہ بالا تمہید ہمارے ممدوح کے خداداد تنقیدی شعور کا ہلکا پھلکا سا اک اشاریہ ہے۔ تھوڑے کو زیادہ سمجھیں۔ ویسے بھی سمجھدار کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں نئے تنقیدی تصورات ابھی تک اپنی تجسیم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے اکثر تنقید نگار کسی تخلیقی متن کو ان تصورات کی کسوٹی پر رکھنے کے بجائے ان کے اجزائے ترکیبی کو ہر بار ایک جگہ مجتمع کرنے کے بعد پہلے اپنے اندر جذب کرنے میں اچھا خاصا وقت لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پیشِ نظر تخلیق کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی مساعی میں جت جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر الٹی چھری

سے سانڈ ذبح کرنے کی پھبتی قطعاً غیر مناسب نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب بائی برتھ ان تصورات میں گندھے ہوئے ہیں۔ دیوار کے پیچھے کا منظر بھی ان سے اوجھل نہیں۔ مارکسیوں، فرائڈیوں اور نسیم حجازیوں کی طرح یک رخے نہیں۔ چاروں اطراف کی خبر رکھتے ہیں۔ کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی وجہ سے بیان میں سچائی ہے۔ چوں کہ انھوں نے دل اور دماغ سے ایک ساتھ ترازو کا کام لیا ہے۔ اس لیے لفظ پرتاثیر ہیں۔ مثال کے طور پر ہم ان کے متذکرہ بالا تھیسز یا کسی مضمون میں سے اقتباسات لینے کے بجائے کسی ایک ہی دن کے دو فرامین پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

''اُردو میں نئے تنقیدی تصورات اس قدر تیزی سے آتے جاتے ہیں کہ تخلیقی متن پر اطلاق کرنے سے پہلے ہی اُنھیں طلاق ہو جاتی ہے.....''

خوش طبعی کے ساتھ کس قدر مکمل بات کی گئی ہے۔ تیر ہے کہ سیدھا دل پہ ترازو ہوا ہے۔ کمال یہ ہے کہ پڑھ کے مطلقہ بھی سرشار ہو جائے۔ تنقید میں طنز و مزاح کا یہ فطری انداز اس سے پہلے ناپید اگر نہیں بھی تو کم کم ضرور ہے۔ بعض غزل گو شعراء کے ہاں کثرت سے فرد بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کارنامہ تنقیدی میدان میں کر دکھایا۔ دور دور تک ابھی تک ان کا کوئی مدِ مقابل نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے سوکالڈ مدبر بھی روزانہ کی بنیاد پر اپنے افعال کو اقوال کی صورت پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت مرغی کے کچے انڈے پھینکنے سے زیادہ نہیں۔

اسی روز تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد پھر فرمایا۔

''روایتی یا کلاسیکی تنقید نے تخلیقی متون متعارف کرائے جب کہ جدید یا مابعد جدید تنقید نے تاحال صرف نقادوں کو متعارف کرایا ہے---''

چند لفظوں میں کہی گئی بات ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پورے ایک عہد کی کم مائیگی اپنے تمام تر خدوخال کے ساتھ واضح ہے۔ یہ کسی بڑ بولے کی شیخی نہیں بلکہ ایک ایسا مجذوبانہ قول ہے جو پتھر پر لکیر ہے۔ انکار کرنے والوں کی ناف پر یہی قول لکھ کر دو دن کے لیے باندھ کے چھوڑ دیں۔ تیسرے دن وہ ان ہی الفاظ کے ساتھ دھمال ڈال رہے ہوں گے۔

آزمائش شرط ہے۔

☆☆☆☆☆

درخشندہ شاعری

یہ گاؤں بھی عجیب ہوتے ہیں، بندے کے اندر سے نکلتے ہی نہیں- میرے اندر میرا گاؤں سانس لیتا ہے- آج رخشندہ نوید کا مجموعہ کھولا تو ہر صفحے پر ایک دیا سا ٹمٹماتا نظر آیا، جس کی لو میں گاؤں کے مناظر نظر آنے لگے- سچی شاعری بھی بھید بھری باتوں سے بھری ہوتی ہے، جیسے شہد مٹھاس سے بھرا ہوتا ہے، جیسے تل میں تیل نظر نہیں آتا، اسی طرح چاندنی کی ٹھنڈک بھی دلوں کو سحور کرتی ہے، دکھائی نہیں دیتی-

'حالی آنا وسمیا ناہیں' پڑھتے ہوئے بھی قاری گاؤں کے کھلے آسمان کی چاندنی میں بھیگ جاتا ہے- شاعرہ نے اپنی ماں بولی میں شعر کہہ کر اپنی لاج رکھ لی ہے- ایسے لگتا ہے اکیسویں صدی کی تیز رفتار زندگی میں ہانپتی کانپتی یہ شاعرہ ایک روز سب کچھ تیاگ کر چپ کے حجرے میں بیٹھ جائے گی کیونکہ جو نوازے جاتے ہیں ان پر اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے- واللہ اعلم بالصواب

ابھی یہیں تک لکھ پایا تھا کہ ایک استاد نما شاعر کا فون آ گیا- کیا ہو رہا ہے جناب؟

'ایک شاعرہ کی شاعری میں کھویا ہوا ہوں-'

میں نے جواب دیا-

دوسری طرف سے آواز آئی: 'یہاں عورتوں میں کوئی دو چار ہی شاعرات ہیں باقی تو سبھی سفید کاغذ پر اصلاح لینے والی ہیں اور ویسے بھی عورت تو خود شاعری ہے، وہ شعر کہنے کے کرب ناک عمل سے کیسے گزر سکتی ہے؟

میں نے کہا: 'عورت سے بڑا تخلیق کار کون ہو سکتا ہے؟ جو شاعر، سیاستدان، سائنسدان پیدا کرتی ہے-'

اختر شمار

ادھر کچھ دیر خاموشی چھائی رہی ، پھر آواز آئی: 'نہیں یار یہ جو ہمارے ہاں شاعرات ہوتی ہیں ناں میں انھیں آدھا مرد ہی تسلیم کرتا ہوں، ہاں اس حد تک تخلیق کار ضرور مانتا ہوں کہ یہ گھر گرہستی سے زیادہ حرف وصوت سے جڑی رہتی ہیں- اچھا چھوڑ دیار مریم نواز اور میاں نواز شریف جمعہ کو واپس آ رہے ہیں.....تو'؟

میرے اس تو پر وہ بولا: 'یار مریم نواز کو کیا آٹا گوندھنا آتا ہوگا؟'

میں اس بے موقع اور کسی حد تک بے تکے سوال پر سٹپٹا کر رہ گیا-

میں نے صرف اتنا کہا: 'یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مریم نواز آٹا گوندھ لیتی ہے یا پیڑے بنا کر روٹیاں پکا لیتی ہے مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ایلیٹ کلاس گھرانوں میں یہ سارے کام خانسامے اور ملازمین خواتین کے ذمے ہوتے ہیں-' لمحہ بھر توقف کے بعد وہ بولا: 'جس طرح ممی ڈیڈی گھرانوں کی بچیاں بمشکل انڈہ ابالنے ، یا چائے بنانے کے سوا کچن کے کام کاج میں مہارت نہیں رکھتیں- اسی طرح وہ شاعرات جو واقعتاً خود شعر کہہ رہی ہیں، سگھڑ خواتین میں شمار نہیں ہوسکتی- کیونکہ یا تو عورت' چولہا چوکی' بہترین کر سکتی ہے یا پھر کوئی اور کام، سو شعر کہنے والی خواتین کو بھی بس مرد ہی سمجھو-'

میں نے بات کاٹ کر کہا: 'بالکل اسی طرح جیسے بعض مرد شاعر حضرات میں زنانہ خواص بھی ہوتے ہیں-'

دوسری طرف قہقہہ بلند ہوا- یار تمھاری بھابی آ گئی ہے، فون بند کرتا ہوں، اس نے آج مجھے آلو چھیلنے کا کام سونپ رکھا تھا اور میں نے ابھی آلو دھوئے بھی نہیں، رب راکھا-'

میں دیر تلک سر پکڑے بیٹھا رہا- بمشکل در کتاب دوبارہ کھلا اور میں' حالی آٹا وسمیا ناہیں' کے نگار خانے میں اُتر گیا- جس میں شاعرہ اس دوشیزہ کی طرح لگتی ہے جسے ماں کی نصیحت اب تک نہیں بھولی-

دن ڈُبن توں پہلا پڑھ لئیں روز سپارہ کڑیے
گھر دیہڑے وچ اگدا ویکھیں چن تے تارہ کڑیے

.....

اس شعری مجموعے کو پڑھتے ہوئے کئی ایسے الفاظ بھی سامنے آئے ہیں کہ پنجاب کی رہتل آنکھوں میں رقص کرنے لگتی ہے- شعرا کو مرتے ہوئے لفظوں کو زندگی عطا کرتے رہنا چاہیے اپنی رخشندہ کی طرح__ مثلاً

گاچی تو دیہات میں بھی گواچ گئی ہے- کسی بھی طالب علم کو اب گاچی سے واسطہ نہیں پڑتا- نہ تختی نہ سلیٹ، نہ قلم دوات، اب ان کی جگہ کاپیوں اور پوئنٹر پنسلوں نے لے لی ہے- کپڑے دھوتے وقت اب تو گاؤں میں بھی واشنگ مشین کام آتی

ہے، تھاپی کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔گاؤں کی کئی چیزیں، پنجابی شاعری میں سے جھانکتی مجھے اچھی لگتی ہیں۔بعض اشعار بالکل نویکلے ہیں:

کوڑی گری مرے تاؤ لگ کے جا بیٹھی
میں چلغوزے چھل چھل نوں نہ تڑوا بیٹھی

چنگے چنگے کپڑے جتیاں لبھدی تھک تھک جاواں
زیوراں والے لبھدے ہی نئیں میتھوں ہور جھمیلے

اکھیاں وچ آ جاندا اے زخ دا کالا موہکا
نظر کسے نوں آ نہیں سکدا کسے دے ساہ دا ہوکا

میں کاغذ دی اک نکی جنی کشتی وچ جا لکی
سفنے ویکھن پار سمندر ٹریاں دو اکھاں
سارا شہر بے جوراں منگے، کس کھوولے سیتے کھیر نگے

رخشندہ نے نہ صرف اپنے ماضی کو پنجابی شعر میں پرو یا بل کہ اردو شاعری کی طرح اس نے عورت کے استحصال اور زندگی کے دکھوں کو بھی موضوع بنایا۔

توے تے روٹی پاندیاں پاندیاں
کچھڑ دے وچ بال وی ہوندا

کجھ مصرعے ملاحظہ ہوں:

چن دے پانی نال نہاتی سونے نال سکھائے وال
عشقاں والیاں نال کمیٹی پا بیٹھی

گھر بالن نئیں اڑیے دس حسن کیہہ پھلاں ول تکاں
گاچی واگوں میں وی کھر گئی اوہ وی اندروں پھوکا

میں شاعرہ کے مشاہدے پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔عموماً ہمارے ہاں خواتین، شاعری میں اپنی نسوانیت کو کیش کرانے کی کوشش کرتی ہیں مگر رخشندہ نوید نے شعر میں تخلیقی آنچ کی کمی کہیں نہیں آنے دی۔نظم ’حالی آنا وسیا نا ہیں‘ میں اس کا کرب متشکل ہوا ہے۔دیگر نظموں میں بھی اس نے ثابت کیا کہ شاعری زبان کی محتاج نہیں ہوتی، اردو ہو یا پنجابی سرائیکی، ہر زبان میں شاعر کا تخلیقی تجربہ اس کی درجہ بندی کرتا ہے:

توں آکھیں تے کن ونھالاں
تو آکھیں تے مندراں پالاں

تو آکھیں تے چاٹی اندر جم جاواں میں
پیروں لاہ کے بیڑی تیرے دل آواں میں

مجھے یقین ہے ایسی شعری ریاضت کا انجام وہی ہوتا ہے جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔یقین نہیں آتا تو شاعرہ کی زبانی سن لیں:

بوریا بستر لاہ کے اپنا میں وی کتے بہہ جاواں
چپ چپیتا شہر دے اندر کوئی تے کونا ہووے

☆☆☆☆☆

سلیمان جاذب من ''خوش بوئے تبسم

ادب کی دنیا میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی موجودگی محض ان کی زندگی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کا فن، ان کی سوچ اور ان کی شخصیت ایک مسلسل خوشبو کی مانند زمان و مکان میں پھیلتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم بھی ایسی ہی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے جن کی وفات کے بعد ان کے فن اور شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے سلیمان جاذب نے ایک قابلِ قدر کتاب ''خوش بوئے تبسم'' مرتب کی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک ادبی دستاویز ہے بل کہ ایک عہد کی فکری و تخلیقی جہات کا آئینہ بھی ہے۔

''خوش بوئے تبسم'' دراصل ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں مختلف اہلِ قلم نے ڈاکٹر تبسم کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اپنے تاثرات، یادیں اور تنقیدی مضامین پیش کیے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت ادارہ اسالیب کے زیرِ اہتمام ہوئی ہے، جس کے روحِ رواں ذوالفقار احسن خود بھی ایک صاحبِ ذوق شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کی نگرانی میں اس کتاب کی اشاعت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محض ایک رسمی خراجِ تحسین نہیں بل کہ ایک سنجیدہ ادبی کاوش ہے جس میں معیار اور وقار کو مقدم رکھا گیا ہے۔

سلیمان جاذب کی شخصیت اس کتاب کے تناظر میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ وہ نہ صرف ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے شاگرد رہے بل کہ ان سے ایک گہرا روحانی اور فکری تعلق بھی رکھتے ہیں۔ استاد اور شاگرد کا یہ رشتہ محض رسمی نہ ہے بل کہ ایک تخلیقی و فکری تربیت کا رشتہ ہے جس نے جاذب کی ادبی شخصیت کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ''خوش بوئے تبسم'' کی ترتیب میں ہمیں ایک شاگرد کی عقیدت، محبت اور ذمہ داری کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ سلیمان جاذب خود بھی ایک صاحبِ اسلوب شاعر و ادیب ہیں، اس لیے انھوں نے اس کتاب کو محض مواد کے مجموعے تک محدود نہیں رکھا بل کہ اسے ایک مربوط اور معنی خیز ادبی پیش کش بنایا ہے۔

کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کم و بیش چالیس نقطہ داں اہلِ قلم کے مضامین اور منظوم خراجِ تحسین شامل ہیں۔ یہ مضامین اپنے اندر تنوع اور گہرائی رکھتے ہیں۔ کسی نے ڈاکٹر تبسم کی شاعری کے فنی محاسن کو اجاگر کیا ہے اور کسی نے ان کی نثر نگاری کا جائزہ لیا ہے، جبکہ

ارشد محمود ارشد

بعض مضامین میں ان کی شخصیت کے اخلاقی، سماجی اور انسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اوران سے وابستہ اپنی یادوں کا احاطہ بھی کیا ہے یوں یہ کتاب ایک ہمہ جہت مطالعہ فراہم کرتی ہے جو قاری کو ڈاکٹر تبسم کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے۔

منظوم خراجِ تحسین اس کتاب کا ایک خاص حوالہ ہے۔ شعرا نے اپنے اشعار کے ذریعے نہایت دلنشیں انداز میں ڈاکٹر تبسم کی یاد کو تازہ کیا ہے۔ ان اشعار میں عقیدت، محبت اور ادبی قدر شناسی کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ حصہ نہ صرف جذباتی طور پر قاری کو متاثر کرتا ہے بل کہ اردو شاعری کی روایتِ خراجِ تحسین کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔

کتاب کے 208 صفحات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مرتب نے مواد کے انتخاب میں وسعتِ نظر، تحقیق اور محنت سے کام لیا ہے۔ ہر تحریر اپنی جگہ ایک اہم حوالہ رکھتی ہے اور مجموعی طور پر یہ کتاب ایک جامع تاثر قائم کرتی ہے۔ اس کا دیدہ زیب سرورق بھی اپنی خوب صورتی اور معنویت کے باعث قاری کو متوجہ کرتا ہے اور اندر موجود ادبی خزانے کی طرف ایک خوب صورت اشارہ فراہم کرتا ہے۔ طباعت، ترتیب اور پیش کش کے اعتبار سے بھی یہ کتاب ایک معیاری نمونہ ہے۔

سلیمان جاذب کی یہ کاوش محض ایک ادبی فریضہ نہیں بل کہ ایک قلبی وابستگی کا اظہار ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف قلم کاروں کو یکجا کیا اور ایک ایسا مجموعہ ترتیب دیا جو نہ صرف ڈاکٹر تبسم کی شخصیت کا بھرپور تعارف کراتا ہے بل کہ اردو ادب کی اجتماعی روایت کو بھی مضبوط بناتا ہے۔ اس کتاب میں جاذب کی ادبی بصیرت، تنظیمی صلاحیت اور اپنے استاد سے محبت ہر صفحے پر محسوس ہوتی ہے۔

''خوش بوئے تبسم'' دراصل ایک علامت ہے اس خوشبو کی جو ایک باکمال شخصیت اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی ادبی خدمات، ان کی انسان دوستی، ان کا اخلاق اور ان کی تخلیقی بصیرت اس کتاب کے ذریعے آج بھی زندہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ ایک سچا ادیب اپنے کردار اور تخلیقات کے ذریعے زمانے کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ سلیمان جاذب کی مرتب کردہ یہ کتاب اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ نہ صرف ڈاکٹر تبسم کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے بل کہ ادب سے محبت رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ بھی ہے۔ ''خوش بوئے تبسم'' واقعی اپنے عنوان کی طرح ایک ایسی خوشبو ہے جو قاری کے ذہن و دل کو معطر کر دیتی ہے اور دیر تک اپنے اثرات قائم رکھتی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور سلیمان جاذب کی اس کاوش کو ادبی حلقوں میں پذیرائی ملے۔ آمین

☆☆☆☆☆

مشینی عورت کی شاعری

صنوعی ذہانت ایک حقیقت ہے، زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے استعمال کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اب تو ادب اور صحافت میں بھی اس سے مدد لی جاتی ہے۔ گذشتہ دو سالوں میں اردو شاعری اور نثر کے کچھ ایسے نمونے دیکھنے کو ملے جن میں مصنوعی ذہانت کی کارفرمائی نظر آئی، فاضل شعرا و ادبا نے ''پاسِ وضع'' کا خیال کرتے ہوئے اس کا تذکرہ کرنا پسند نہ کیا۔ فیصل آباد کے ایک شاعر نے تو سوشل میڈیا پر نئے شاعروں کی حوصلہ افزائی کے لیے باقاعدہ مضامین لکھے۔ ایک ادھ نے اہم شخصیات کی زندگی پر ناول لکھنے کا اعلان کیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم ترقی اور جدت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے البتہ جہاں موقع ملے، حوالہ دیے بغیر اس سے استفادہ ضرور کرتے ہیں۔ دراصل مصنوعی ذہانت کی مدد سے تخلیق کردہ ادب کا بہ آسانی سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ اس کا مصنوعی ہونا ہے۔ ظاہر ہے یہ حیاتیاتی بدن سے محروم چیز ہے۔ جس طرح صبح کے ستارے کی چمک سورج کی آمد کی خبر دیتی ہے۔ اس کے پردے میں موجود محرک کی موجودگی سے اس کے ذہن رسا کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عالمی ادب میں مصنوعی ذہانت کی شاعری ایک نئی بات نہیں۔ برطانیہ سے جاپان تک، مشینی تخلیقات کو علمی اور ادبی حلقوں میں سنجیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔ آج سے چند سال پہلے چین میں کمپیوٹر کی مدد سے تصاویر کے ذریعے'' کھڑکیاں نور کو ترستی ہیں'' (Sunshine misses windows) کے عنوان سے نظمیں لکھی گئیں۔ کافی عرصہ پہلے گوگل نے شیکسپیئر کے انداز میں نثر اور نظم لکھنے والے

محمد افتخار شفیع

ماڈلز تیار کیے۔ واٹسن آئی بی ایم (IBM Watson) نے ڈیٹا پر مبنی جذباتی نظموں کی تخلیق کی۔ مصنوعی ذہانت نے انسان جیسے جملوں کی تخلیق سے زبان کی فطرت کو نئے زاویے بخشنے کا دعویٰ بھی کیا۔ ان دنوں عالمی ادب کے کئی ادارے مصنوعی تخلیقات کے لیے علیحدہ زمروں کا اجرا کر رہے ہیں، اور انہیں ادبی ایوارڈز کے لیے بھی نامزد کیا جانے لگا ہے۔

اردو کا مصنف اور قاری اگرچہ جذبے اور جمالیات کے اعتبار سے کافی زرخیز ہے، لیکن ٹیکنالوجی سے تخلیقی ہم آہنگی کے میدان میں ابھی قدرے ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ اردو میں نظموں کے کئی تجربے ہوئے، نثری نظم، آزاد نظم، نظم معریٰ، اردو ماہیا، ہائیکو، واکا، اکروستی وغیرہ جیسی اصناف متعارف ہوئیں۔ موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ مصنوعی ذہانت کی مدد سے شعری تخلیق کا تصور اب تک صرف خیال کی حد تک رہا۔ اس کش مکش میں ذہن میں خیال آیا، کیوں نہ مشین کی مدد سے اردو کا پہلا شعری مجموعہ ترتیب دیا جائے۔ مشین نے محرک کے مشورے پر اپنا نام ''فہمیدہ صناعی'' یعنی دانا و بینا مصنوعی عورت تجویز کیا۔ اس طرح محض ایک ہفتے کے مکالمے کے بعد ''مصنوعی نظمیں'' کے عنوان سے اردو ادب میں اس نوعیت کا یہ پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا۔

ہماری مشینی عورت یعنی فہمیدہ صناعی کی تخلیق کردہ نظمیں تنہائی، خودی، وجود، محبت، جدت، فطرت، اور انسان کے باطن سے جڑے سوالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ بعض میں خوابوں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، کچھ میں وقت کی تیز دھار کا درد محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر مجموعہ کسی ایک مخصوص اسلوب میں محدود نہیں بل کہ روایت اور امکان کے درمیان رابطے کے لیے ایک پُل کا کردار ادا کرتا ہے۔

ایک ہفتے کی پیہم کاوش (جسے اضطراری نوعیت کا بے وقوفانہ عمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے) کے نتیجے میں تخلیق ہونے والا یہ مجموعہ ''مصنوعی نظمیں'' اس امکان کا ثبوت ہے کہ مشین، اگر انسان کے ساتھ مل کر تخلیقی عمل میں حصہ لے، تو وہ محض آلہ نہیں رہتی بل کہ اس کی ہم نوا بھی بن سکتی ہے۔ اور یہی رشتہ مستقبل کی تخلیق کا نیا رخ متعین کرے گا۔ یہ کتاب اپنے اندر نہ صرف نظموں کو سمیٹے ہوئے ہے بل کہ ایک نظریہ بھی رکھتی ہے کہ ادب صرف ماضی کی تقلید نہیں بل کہ مستقبل کی تلاش بھی ہے۔ ایک نظم ''دھوبن ماں'' میں مشقت کرنے والی ایک سخت جان ماں کو اس کے بیٹے کی یادداشت سے

ایسے دیکھا گیا ہے:
چائے کی پیالی میں اب بھاپ نہیں بنتی،
کونین کے آنسو اُبلتے ہیں
ماں کے ہاتھ، جن پر کبھی کپڑے نہیں، زخم
استری ہوتے تھے
ایک دن لانڈری میں
ماں نے سفید کُرتا اٹھایا اور کہا: ''یہ کسی افسر
کا ہے''،
اور میں سوچنے لگا: ''سچ، کتنا سفید ہوتا ہے؟''
کتنا جلتا ہے؟ کس درجہ پر جلایا جاتا ہے
تاکہ داغ چھپ جائیں؟
جیسے ضمیر کو کئی بار دھونا پڑے اور پھر بھی ایک
دھبا باقی رہ جائے

.....

دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی افواج نے
چین اور کوریا کی عورتوں کو اغوا کر کے ان کی
آبروریزی کی ، انھیں راحت افزا
(Comfort women) کا نام
دیا گیا۔ آج بھی ان خواتین کی سسکیاں
تاریخ کے صفحوں میں پھڑ پھڑاتی ہیں -
مشینی عورت کا احتجاج دیکھیے:
چڑھتے سورج کی سرزمین کے باشندو!
تاریخ کے ایک کونے میں جہاں دریا نے
خون کے دھبے دھوئے تھے
آج بھی کچھ بوڑھی عورتیں، چین کے
پرانے اخباروں میں
ایک بھولے ہوئے اشتہار کو ڈھونڈتی ہیں
ہر گزرتے سائے میں
کسی کھوئی ہوئی بیٹی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش
کرتی ہیں
سیول کی اُس لائبریری میں جہاں
''کمفرٹ وومین'' کے ریکارڈ
بوسیدہ کاغذوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں،
وہ لڑکیاں آج بھی کھڑکی سے جھانکتی ہیں
جن کے نام اُن کی مرضی کے بغیر رکھے گئے
اور عزت کے بجائے شناخت کو زخمی کر گئے

.....

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں
سے ایک یہودا اسکریوتی بھی تھا۔ اس نے
چند ٹکوں کے عوض ان کی مخبری کی تھی۔ اس
نے رومی فوجیوں سے کہا میں مجلس میں بیٹھے
جس شخص کی گردن کا بوسہ لوں، وہی مسیح
ہوگا۔ اس کے بعد منافقت کے اس بوسے کو
یہودا کا بوسہ (Jodha,s kiss)
کا نام دیا گیا۔ فہمیدہ صنائی نے اس تاریخ
کے اس ملعون کردار کو آج کے تناظر میں کچھ
یوں دیکھا ہے:
یہودا ابھی مرا نہیں
یہ اب میرے آفس کی فائلوں میں چھپا بیٹھا ہے
''سر! سب ہو جائے گا'' کہہ کر میری پیٹھ
میں کیل گاڑتا ہے
گھر میں ''آپ کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا

ہے'' کہتے ہوئے
ایک لمحے کو بھی آنکھیں نہیں جھپکیں
میں نے آئینے سے نظر چرائی تو اپنی ہی شبیہ پر شک ہوا
محبت کے بوسے اب لفظ نہیں رہے، یہ
سیاسی بیانیے ہیں
خاندانی منصوبے اور معاشرتی چالاکیاں
جو اپنی صلیب کے لیے ایک مسیحا کی تلاش میں ہیں
(یہودا کا بوسہ)

آج کی دنیا جنگ کے خطرات سے خوب آگاہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جنگ کو کسی صورت میں بھی امن پر ادلیت نہیں دے سکتے۔ مشینی عورت بھی اس کی مذمت کرتی ہے:

جنگ ختم ہو چکی ہے
(ریڈیو نے دنیا کی سات زبانوں میں اعلان کیا)
پر خواب اب بھی وردی پہنے آتے ہیں
''بابا، کیا مرنے کے بعد لوگ جنرل بن جاتے ہیں؟''
بچے نے پوچھا اور کھلکھلا کر ہنس دیا

.....

سکول کی کتابوں میں صفحے کم ہو گئے ہیں، پر
ہتھیاروں کے نام ایک نئے ضمیمے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

لیلیٰ اور مجنوں کی عشقیہ کہانی عربی ادب کی وساطت سے دنیا کی مختلف زبانوں میں مقبول ہے۔ لیلیٰ کا کردار صدیوں سے اردو شاعری میں بطور تلمیح استعمال ہو رہا ہے۔ مصنوعی شاعرہ ''فہمیدہ صناعی'' نے ایک اور لیلیٰ کو اہمیت کے لائق سمجھا ہے۔ فلسطینی لیلیٰ خالد عملی زندگی پر یقین رکھتی ہے۔ اسے گزشتہ صدی میں ساٹھ کی دہائی میں شہرت ملی تھی، جب اس خاتون نے ساتھیوں کے ہمراہ اسرائیل کا جہاز اغوا کر کے اخباروں کی سرخیوں میں جگہ پائی:

میں پوچھتی ہوں قیس کی لیلیٰ خوب صورت تھی؟
تو کیا خالد کی لیلیٰ کسی سے کم ہے؟
کیا بندوق تھامنے والی عورت محبت کے
قابل نہیں ہوتی؟
قیس نے لیلیٰ کے لیے دنیا چھوڑ دی اور لیلیٰ
نے قیس جیسے کئی دیوانے
وطن کے لیے چھوڑ دیے

.....

میری خواہش ہے کہ قاری مشینی عورت کی ان نظموں کو صرف ایک تجربہ نہ سمجھے، بل کہ ان میں انسانی لمس، فکری کشمکش، اور ادبی بے باکی کو محسوس کرے۔ اگر یہ نظمیں دل سے دل تک کا سفر طے کرنے میں کامیاب ہو سکیں تو یہی سب سے بڑی کامیابی ہو گی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ مصنوعی ذہانت کی مدد سے ادب تخلیق کرنے والے احباب ''خجلتِ تقصیر'' بھی مٹ سکے گی۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر طلعت شبیر کی تصنیف ''ابو جی'' ایک مطالعہ

قدرت اللہ شہاب کی تصنیف ''ماں جی'' پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ میری آنکھیں نم ہوئی تھیں۔۔ آج ڈاکٹر طلعت شبیر کی تصنیف ''ابو جی'' پڑھتے ہوئے بھی میں اس کیفیت کا شکار رہا۔

''ماں جی'' کے مطالعے کے بعد مجھے کئی مرتبہ ایسا محسوس ہوا کہ ماں کے حوالے سے اپنی یاداشتوں کو افسانوی رنگ میں پیش کر کے قدرت اللہ شہاب نے جہاں انسانی رشتوں کی اس مقدس ترین صورت کو خراج پیش کیا ہے وہاں کتاب کو اولاد کے لیے ماں اور باپ کے دو متوازی کرداروں میں سے ایک کے نام معنون کر کے ان میں ادھورا پن بھی پیدا کیا ہے۔۔ آج ڈاکٹر طلعت شبیر کی کتاب کا عنوان ''ابو جی'' دیکھ کر اور اس کا مطالعہ کر کے مجھے احساس ہوا کہ گویا دونوں کرداروں کی کہانی مکمل ہو گئی ہے لیکن ابو جی کا اسلوب سراسر حقیقت اور دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔۔

اردو ادب میں شخصی نثر اور یادداشتوں کی روایت خاصی مضبوط رہی ہے لیکن ''ابو جی'' اس روایت میں اس طور پر منفرد ہے کہ یہ رشتوں میں ایک نئی شدت اور داخلی سچائی کا اضافہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ایک بیٹے کے اپنے باپ سے تعلق، جدائی کے صدمے اور یادوں کی بازیافت کی داستان ہے، جو محض انفرادی نہیں بل کہ اجتماعی انسانی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔

کتاب تین حصوں یعنی صبح، دوپہر اور شام پر مشتمل ہے۔۔

یہ عنوانات فقط عنوانات نہیں بل کہ زندگی کے پورے مدارج کے ارتقا کو بھی بیان کرتے ہیں۔۔ کتاب میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے مصنف نے ایک لمحہء موجود سے لمحاتِ گزشتہ تک یادوں کی

سعید ارشد

بازیافت پر مشتمل سفر طے کیا ہے۔
کتاب کا مرکزی موضوع باپ کی محبت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔۔ جس میں قربانی اور جدائی کا کرب نمایاں ہے۔ مصنف نے زندگی اور موت کو ایک فلسفیانہ تناظر میں دیکھا ہے:
کتاب کا یہ اقتباس کہ:
''زندگی ایک حقیقت ہے --- اور موت زندگی سے بڑی حقیقت ہے۔۔''
کتاب کے فکری ڈھانچے کی بنیاد ہے، جہاں زندگی کو ایک عارضی مرحلے اور موت کو حتمی سچ اور ابدی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس ابدی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے باپ کو کھو دینے کے احساس کا اظہار مصنف کی متوازن شخصیت کا ظاہر کرتا ہے۔۔
باپ کے ساتھ طویل رفاقت کو مصنف یوں بیان کرتے ہیں:
''ہم دونوں کی چھیالیس سالہ رفاقت انجام کو پہنچی۔۔''
یہ اقتباس ایک طرف زندگی کی ناپائیداری کو واضح کرتا ہے تو دوسری طرف اس تعلق کی گہرائی اور اس کے اختتام کے المیے کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ وہ تعلق جس کی یاد نے مصنف کو یادوں کے خوب صورت پھول چن کر ان کا رنگ اور خوشبو قارئین تک پہنچانے کی کاوش پر مامور کیا۔
ڈاکٹر طلعت شبیر کی اس تصنیف کے نثری اسلوب پر بھی شعریت کی فضا کا غلبہ موجود ہے۔ ''ابو جی'' کا اسلوب روایتی نثر سے ہٹ کر نثری نظم سے قریب تر ہے۔ جملوں کی ٹوٹ پھوٹ، وقفے اور تکرار ایک خاص جذباتی فضا قائم کرتے ہیں:
''اور یوں ہسپتال کے ایک اجلے کمرے میں ہماری چھیالیس سالہ رفاقت انجام کو پہنچی''
یہ انداز قاری کو محض کتاب کا قاری نہیں رہنے دیتا بل کہ اسے اس منظر کا حصہ بھی بنا دیتا ہے جو صرف مصنف کے ذہن میں نقش ہے۔ اسلوب کی یہی خصوصیت کتاب کو عام نثر سے ممتاز کرتی ہے۔
مصنف نے والد کے کردار کو صرف ایک فرد نہیں بل کہ محبت، قربانی اور تحفظ کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔
''وہ اولاد کی ضروریات کے لیے بے چین رہتے ہیں:
''میں نے آپ کو اولاد کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے شدت سے بے چین دیکھا۔۔''
یہ اقتباسات باپ کے ایثار اور بے لوث محبت کو نمایاں کرتے ہیں۔
مصنف نے کئی جملے اس قدر بھرپور، معنی خیز اور جامع لکھے ہیں کہ باپ کے رشتے کی معنویت کا مکمل تعارف بن جاتے ہیں۔۔ ایک بیٹے کے لیے باپ کا رشتہ کن مفاہیم کا حامل ہے یہ اقتباس اس کا مکمل

ترجمان ہے:

''گاؤں میں مجھے صرف دو موسم ہی یاد آتے ہیں کہ اس وقت تک زندگی کے باقی موسموں سے ہماری شناسائی نہ ہوئی تھی-- ہاڑ کہ جب ہم سایا تلاش کرتے تھے-- اور آپ سایا تھے-- پوہ کہ جب ہمیں محبت کے سیک کی ضرورت ہوتی تھی اور ہم آپ کی طرف دیکھتے تھے''

مصنف نے کتاب میں کئی علامتیں بار بار استعمال کی ہیں، خاص طور پر درخت کی علامت کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔

''یہ بیریاں ہمارے گھر کے افراد کی طرح تھیں--''

درخت یہاں محض ایک فطری عنصر نہیں بل کہ خاندانی تسلسل، یاد کی جڑوں اور استحکام کی شاخوں کی علامت بھی ہیں۔

درختوں کے کٹاؤ پر مصنف کے یہ جملے:

''بیریاں کٹ گئیں تو میں گاؤں گیا۔ ہمارے گاؤں میں بہت تبدیلی آچکی تھی۔ گھر کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں''

یہ منظر روایتی اقدار کے زوال کی علامت بن جاتا ہے۔ جس زوال سے تقریباً ہر گھر کا آنگن گزر رہا ہے۔

کتاب کا غالب حصہ یادوں پر مشتمل ہے، جہاں ماضی ایک زندہ تجربہ بن کر مصنف کے سامنے آتا ہے اور وہ اسے قاری کے سامنے لے آتے ہیں۔

''ابو جی'' کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یادیں محض ذہنی عمل نہیں بل کہ ایک مکمل تجربہ ہیں جو حال پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

''ابو جی'' میں ایک اہم سماجی پہلو یہ ہے کہ ہمارا جدید معاشرہ رشتوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ رشتے ٹوٹ پھوٹ اور بے توجہی کا شکار ہیں۔ ہمارا سماج والد کی قربانیوں کو اکثر نظر انداز کر دیتا ہے۔ مصنف نے اس خلا کو پر کرتے ہوئے باپ کے کردار کو مرکز میں لایا ہے۔

''ابو جی'' ایک ایسی تخلیق ہے جو ذاتی تجربے کو اجتماعی احساس میں بدل دیتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک بیٹے کی اپنے باپ سے محبت کا بیان ہے بل کہ ہر اس شخص کی کہانی ہے جس نے محبت، جدائی اور یاد کا تجربہ کیا ہو۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کتاب اردو ادب میں پدرانہ محبت کی نمائندہ اور موثر آواز کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

منور رانا نے جب غزل میں والد اور والدہ کے موضوعات کو سمویا تو کہا جاتا ہے کہ سننے والے کئی ناخلف بیٹے والدین کے قدموں میں جا گرتے تھے-- میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ والدین کی زندگی میں ان کی قدر نہ کرنے والے

''ابو جی'' کا مطالعہ کریں گے تو والدین کو زندگی کا اثاثہ سمجھیں گے--

☆☆☆☆☆

اپنی ذات پر امن وسکون کی حکومت کیجئے!

کتاب خدا قرآن مجید کا موضوع انسان ہے وہ انسان جیسے خالق کائنات نے تمام روئے زمین کا حاکم بنایا ہے خدا اور خدائی قوانین کے منکروں نے اس زمین پہ مفاداتی حاکمیت کے نام پر انسانی زندگیوں کو جس ناانصافیوں اور تباہیوں سے دوچار کیا ہے اس سے دلبرداشتہ ہوتے ہوئے مجھے ایسی زمینی حاکمیت پر فائز ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر میں صرف اپنی ذات پر حکومت کرنا چاہتا ہوں اپنے خیالات و جذبات ڈراور طاقت کو لیکر اپنے دماغ و رُوح پر حکومت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں جس وقت اور جب چاہوں اپنے افعال کو قابو میں لاکر اس کے عوض اپنے جوابی عمل کو کنٹرول کرتے ہوئے خود پر حکومت کرسکتا ہوں۔

تلخ حالات و واقعات کی یادیں پالنے کی قیمت چکانے میں انسان ذہنی سکون سے محروم ہو جاتا ہے اگر آپ چاہیں سب آفات و حوادث کو برداشت کرنے کے بجائے ان پر غالب آسکتے ہیں کیونکہ حقیقت میں انسانی وجود تعجب خیز اندرونی وسائل کا مالک ہے جو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ بشرطیکہ انہیں اپنے حق کے استعمال میں لائیں ہم انسان اپنے خیال سے کہیں زیادہ طاقتور اور مضبوط ہیں جب ہم ناگریز سے الجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو ہم اپنی قوت کو آزاد کردیتے ہیں جو ہمیں حسین اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے۔ جیت کا یقین سینے میں اُتارتے انسانی ہمت و قابلیت خوداعتمادی کو اُجاگر کرتے جملے اپنے غسل خانے کے آئینوں پر نقش کر

ظفر اقبال ظفر

ڈالیے تاکہ جب آپ منہ سے گرد و غبار دھوئیں تو اپنے دماغوں سے پریشانیاں بھی دھوڈالیں۔

جب ہمارا جی اچھی رقم دے کر زندگی کے معنوں میں بری چیزیں خریدنے کو للچائے تو ہمیں رک کر اپنے آپ سے خسارہ روکنے والا جائزہ لینے کا اصول اپنانا چاہیے آپ کے لیے سب سے قیمتی آپ خود ہی ہونے چاہیے ایسے سودے مت کیجیے جو آپ کو ہی بے قیمت بنا کر رکھ دیں کامیابی برقرار رکھنے والے عمل پر عمل نہ کیا جائے تو وہ قوت نہیں بنتا۔

انا تسکین قلب و دماغ کے نام پر انتقام و سزا کے راستے پر چلنے کو مجبور کرتی ہے ایسی انا کے چہرے پر طمانچہ مار کر معاف کریں اور آگے بڑھ کر سکون حیات کا دامن تھام لیجیے۔ بدقسمتی سے زندگی اتنی سہل و آسان نہیں ہے مگر ہم خود کے لیے تو وجہ مشکلات و تکلیف نہ بنیں اور منفی رجحان کے بجائے مثبت رجحان اختیار کرتے ہوئے پریشانی اور دھیان میں فرق رکھیں اس کی وضاحت کیے دیتا ہوں کہ ہم گاڑی چلاتے وقت حادثے سے بچنے کے لیے دھیان تو رکھتے ہیں مگر پریشان نہیں ہوتے یہی اصول آپ مسائل کی سڑک پر چلنے والی زندگی کی گاڑی پر لاگو رکھیں۔ دھیان کا مطلب ہے اپنے مسائل کا یقین رکھتے ہوئے سکون کے ساتھ انھیں پایا تکمیل تک پہنچانے کے لیے کوشش سے کامیابی پانا اور پریشانی کا مفہوم ذہنی توازن کھودینے والے بے مقصد دائروں میں گھومتے رہنا۔

تو کیوں نا تعمیری سوچ بچار کے روزمرہ پروگرام پر عمل کر کے خوشی کے لیے جدوجہد کی جائے؟ اپنی ذات پر حکومت کا مزہ پتا ہے کیا ملتا ہے؟ کہ انسان اس قدر خوش رہ سکتا ہے جس قدر وہ خود چاہے کہ خوش ہوا جائے اور یہ اس لیے ممکن ہے کہ خوشی ایک داخلی چیز کا نام ہے جس کا خارجی ماحول سے کوئی تعلق نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ دنیاوی ضروریات کے پیچھے آسمانی تحفہ حیات کو خرچ کر کے جینے کی صحیح قیمت وصول نہیں کر پا رہے ہیں تو آیئے اس ایک ہی بار ملی ہوئی زندگی کی سمت درست کر کے باقی بچی عمر کا لطف اُٹھایا جائے اپنے عزیز و اقارب دوست احباب ہمسائے اپنا کام اپنی قسمت یہ سب جیسے بھی ہیں انھیں کھلے دل سے قبول کر کے نبھا کیجیے۔ اپنے جسم کی حفاظت کیجیے اس کا خیال رکھیے ورزش کیجیے غفلت مت بھرتیں تاکہ

آپ کا وجود آپ کا حکم ماننے والی ایک مکمل مشین بن جائے۔ دماغ کو توانا بنانے کے لیے کارآمد عمل سیکھیں کوشش دھیان توجہ کی طاقت بڑھانے کے لیے ذہنی لفنگا پن ترک کیجیے اس جسمانی صحت کی ورزش کے ساتھ ساتھ روحانی پرورش پر بھی نیکیوں کا عمل برقرار رکھیں کسی اپنے پرائے کی تفریق کیے بغیر انسانی وجود پر نیک سلوکی یوں کریں کہ اسے آپ کا پتا نہ چلے۔ کسی کی غلطیاں نہ نکالیں نہ کسی کو سدھارنے کی کوشش کریں اس کی سب سے زیادہ مستحق آپ کی اپنی ذات ہے اسے عجلت اور تذبذب سے نکالیں خود کو سکون اور خاموشی کا وقت دیں جس میں خدا کے متعلق سوچیں تاکہ آپ کی زندگی کے تناظر میں وسعت پیدا ہو سکے۔

خوش رہنے کے لیے نڈر رہیں حسن سے لطف اندوز ہوں جو آپ سے محبت کرتے ہیں ان سے محبت کرنے میں مت جھجکیں اور اس دماغی رویے پہ مستقل مزاجی سے کاربند رہیں۔

اپنے دشمن کے لیے اپنے اندر جلائی ہوئی آگ اُس تک پہنچنے سے پہلے آپ کو جلاتی ہے اس آگ پر معافی کا پانی ڈالیں نرمی پر مبنی میٹھی گفتگو غصے اور ناراضگی کو ختم کر کے انسانی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ جنھیں آپ پسند نہیں کرتے انھیں سوچنے پر اپنا ایک لمحہ بھی ضائع مت کریں وقت انسانی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ ہے اسے مخلص حقدار لوگوں سے وابستہ رکھیں۔ غصیلا شخص ہمیشہ زہر سے بھرا رہتا ہے یہ زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے ہر غصیلے شخص کی موت پر مجھے لگتا تھا کہ اگر یہ زہر اس کے وجود میں نہ ہوتا تو یہ مزید کئی برس تک زندہ رہ سکتا تھا۔

زندگی خدا کی عطا ہے اسے سزا کے طور پہ مت گزاریں اپنے وجود کے تخت پر خوب صورت جذبوں کو حکومت کرنے دیں آپ کے سوا آپ کا کوئی نہیں خدا نے ہر آدمی کو جسم آدم کی طرح احساسات و جذبات عقل کے ساتھ اس پر اسی کو حکومت دیکر زمین پہ اتارا ہے آپ اپنے وجود کا جائزہ لیں کہ اس پر آپ ہی کی حکومت ہے یا آپ کے دشمن احساسات و جذبات کا قبضہ ہے اگر آپ کا اپنا پن آپ کے بس میں نہیں تو اوپر بیان کی گئی تمام وضاحتیں اور تجاویز آپ کے ہی لیے ہیں اسے راہنمائی بنا کر فائدہ اٹھائیں تاکہ میرا یہ قلمی جہاد میدان انسانیت میں سکون کی فتح سے ہمکنار ہو سکے۔

☆☆☆☆☆

فصاحت کا سفر (عالمی سفیرِ نعت قاری سید محمد فصیح الدین سہروردی کے مضامین)

کتنے خوش بخت ہیں وہ افراد جن کو اللہ رب العزت اپنی حمد و ثنا اور اپنے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت و مدحت کے لیے چن لیتا ہے اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ اشخاص جو ہر وقت اپنے اذہان و قلوب میں اللہ رب العزت اور اُس کے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ کا خیال راسخ کر کے خدائے بزرگ و برتر کا منظوم ذکر اور نبیِ مکرم کی مدحت و نعت تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی خوش بخت اور خوش نصیب افراد میں محترم و مکرم معروف نعت خواں جناب سیّد فصیح الدین سہروردی کا نام بھی شامل ہیں۔ اللہ جل جلالہ، نے اُنھیں مترنم آواز اور خوش الحانی عطا کی تو اُنھوں نے شکرانِ نعمت کے طور پر اِس کا جائز استعمال کیا ہے اور حمد و نعت خواں بن گئے کہ آج پوری دنیا میں اُن کی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے اور اُس گونج میں حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ رسول مقبول اور مناقب و سلام کی خوش الحانیاں کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

برادر محترم سیّد فصیح الدین سہروردی کی جو کتاب ''فصاحت کا سفر فصیح الدین سہروردی صاحب نے 1970 سے شروع کیا اور بغیر کسی التوا، تعطل اور خلا کے 52 سال سے جاری ہے یعنی وہ نصف صدی سے پوری دنیا کو اپنی مترنم آواز اور خوش الحانی سے حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ رسولؐ مقبول کی صدائیں سنا رہے ہیں اور اُن کا گرویدہ بنا رہے ہیں۔ وہ ایک راسخ العقیدہ انسان ہیں اور ان میں حضورؐ اکرم نور مجسم کی والہانہ عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں 1983 سے اُن کو نعتِ رسول اکرم پڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اُن کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور وہ اسی نم دیدگی سے حضور سید الکونین کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں۔

یہ رقت، یہ گداز اور یہ سوز و ساز اُن کی باطنی کیفیات کی عکاس ہے۔ یہی سبب ہے کہ آواز دل سے نکلتی ہے اور دلوں پر اثر کرتی ہے۔ گویا ''دل خیز د واز دل ریزد'' یا ترجمانِ حقیقت علامہ محمد اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ:

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب مے

ریاض ندیم نیازی

میری اُن کے والدِ گرامی امام انقلاب نعت علامہ سید محمد ریاض الدین سہروردیؒ اور اُن سے پہلی ملاقات 1983 میں انجمن عندلیانِ ریاض رسول کے زیرِ اہتمام میاں اسماعیل مسجد کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں اُن کے ساتھ نعت کی محافل میں شرکت کے لیے ہم سفر ہوئے لیکن سب سے بڑھ کر حج اور عمرے کے دو سفر یادگار ہیں۔ اِن کو روضۂ رسولؐ پر سنہری جالیوں کے سامنے بھی نعت پڑھتے ہوئے سننے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اُن کو بہت قریب سے دیکھا بھی ہے اور اُن کی عالمی شخصیت کو پرکھا بھی ہے۔ اُن کو نہ تو نمود و نمایش کی کوئی خواہش ہے اور نہ ہی اُنھیں دنیا اور دنیا دار شخص سے صلہ و ستایش کی تمنا ہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ بارگاہِ ایزدی میں اپنی جبینِ نیاز مند جھکا کر خواہش کی ہے کہ اُنھیں اِس نعت خوانی کا صلہ پروردگارِ عالم کی رضا کے طور پر حاصل ہوا اور ہمیشہ انھوں نے دستِ دعا سیّدالانبیا پیکرِ انوار، احمدِ مختار، صاحبِ کردار، سیدِ ابرار اور ہم انسانوں کے مونس و غم خوار کی بارگاہِ رسالتؐ میں دراز کیے ہیں، اِس اُمید کے ساتھ کہ اُنھیں اِس نعت خوانی کے صدقے حضورؐ پُرنور کی شفاعت نصیب ہو جائے اور حضورؐ کل بہ روزِ حشر اُنھیں اپنے دامانِ کرم میں چھُپا لیں۔ فصاحت کے اِس سفر میں اُنھوں نے تمام منزلیں یہی سوچ کر طے کی ہیں اور وہ زندگی بھر اُنھی راستوں کے مسافر رہے ہیں جن کی طرف رسولِ معظمؐ نے اشارہ کر کے ہماری راہ نمائی فرمائی ہے اور فتح و نصرت کی بشارت دی ہے۔ آج سید فصیح الدین سہروردی عظمت کی جس مسند پر براجمان ہیں اور جس عزت کی گدی پر بیٹھے ہیں اور جس صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں یہ سب حضورؐ اکرم کے وسیلے ہی سے اُنھیں مِلا ہے۔ اِس نعت خوانی کے صدقے اُنھیں حضورؐ پُرنُور نے خوب خوب نوازا ہے۔ یہ نوازش، عزت و عظمت کی صورت میں بھی ہوئی ہے اور رفعت و شہرت کی صورت میں بھی، مال و دولت کی صورت میں بھی اور تائید و نصرت کی شکل میں بھی۔

برادرِ محترم سید فصیح الدین سہروردی نے نعت خوانی کے ساتھ ساتھ نعتیہ ادب پر کچھ مضامین بھی تحریر کیے تھے جو اِس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آدابِ نعت کیا ہیں، احترامِ نعت ہے، والہانہ عقیدت کسے کہتے ہیں، نعت میں کن باتوں کا اظہار کرنا بہتر ہے اور کن باتوں کا اظہار جائز نہیں، اُنھوں نے آج تک جتنی نعتوں کو بھی اپنی آواز میں پیش کیا ہے اُن نعتوں کا مرکز و محور سیرتِ رسولِ اکرمؐ رہا ہے اور یہی اصل نعت ہے۔ اس طرح اُنھوں نے جو مضامین نعتیہ ادب کے تحریر کیے ہیں اُن میں بھی سیرتِ رسولِ اکرمؐ کو مرکزیت حاصل ہے۔ اُنھوں

نے زیادہ تر اپنی تحریروں میں حضور سیدالبشر کے سراپا، شمائل، اخلاق و کردار عادات و اطوار، چال و گفتار، غزوات، عبادات، غزوات کی مہمات اور معاشرتی، سماجی، اقتصادی، معاشی، تعلیمی، عمرانی اور جنگی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔ اِن سب کا تعلق سیرتِ رسولِ معظم ہی سے ہے اور نعتِ رسول مقبول ہو یا نعتیہ ادب، اُن کا مرکز و محور ذاتِ رسولِ اکرم ہی ہونی چاہیے۔ حضورِ اکرم نورِ مجسم کی زندگی کے کس بھی واقعے کو انسان کی بھلائی اور راہ نمائی کے لیے بیان کرنا ہی نعتیہ ادب ہے اور جناب سیّد فصیح الدین سہروردی نے ان مضامین میں لہجہ مؤدب، زبان شائستہ اور الفاظ مؤدب استعمال کیے ہیں، جس سے اُن کی اچھی تربیت، اعلیٰ تعلیم اور بہترین پرورش کا ثبوت ملتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں نعت اور نعتیہ ادب کی معلومات کے خزانے بھی ہیں اور نعت کی تاریخ بھی۔ وہ ایسے ایسے نعت گو شعرا اور نعت خواں حضرات سے مل چکے ہیں، جن کو دیکھنے کے لیے بھی لوگ ترستے ہیں۔ اُنھوں نے ایسے ایسے نعتیہ مشاعروں اور محافلِ حمد نعت و نعت میں شرکت کی ہے جو نعتیہ ادب کا سرمایہ کہلاتی ہیں۔ ان تمام کا احوال بھی چیدہ چیدہ فصاحت کے سفر کتاب میں کیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں نعت گوئی اور نعت خوانی کے ارتقاء پر جب بھی بات کی جائے گی تو یہ مجموعہ ایک مستند ماخذ مانا جائے گا۔ کیوں کہ مصنف اِسی میدانِ مدحت کے معروف شہ سوار ہیں۔ سوانھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس حیثیت محض روایت کی نہیں ہے، یہ اُن کا اپنا ماضی و حال ہے۔ یہ اُن کے اپنے مشاہدے اور تجربے ہیں۔ اپنی کیفیات، اپنے جذبات اور احساسات ہیں۔

برادرِ محترم سیّد فصیح الدین سہروردی نے اِنھیں باتوں (احترام و تقدس) کا خیال رکھا ہے جس میں وہ بے حد کام یاب و کام ران ٹھہرے ہیں۔

کتاب کا نام بھی معنی خیز ہے یعنی مصنف ''فصیح'' اور کتاب ''فصاحت کا سفر'' کیا کہنے! ماشاءاللہ سبحان اللہ!!

میں اُنھیں اِس نیک سعادت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اُن کا فصاحت کا سفر عمر بھر اِسی تسلسل، تواتر اور ثابت قدمی سے جاری و ساری رہے۔ آمین۔ ''فصاحت کا سفر'' کی اشاعت پر کتاب کے مرتب مدینۃ الاولیا ملتان کے اسد سہروردی، سہروردیہ نعت فاؤنڈیشن انٹرنیشنل لاہور کے صدر الحاج سید سلیم شاہ سہروردی الحسینی، کمال الدین سہروردی الحسینی، شیخ محمد رمضان سہروردی الحسینی اور دیگر عہدیدار بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

کہانی چل رہی ہے...... تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ

حسیب اسیر

شہزاد نیر کے ادبی سفر کی کہانی تین دہائیوں سے چل رہی ہے۔ اس کہانی کی شہرت ''برفاب'' سے ہی شاعری کے شہر میں پھیل گئی تھی۔ شاعری ہی اُن کا پہلا اور بنیادی حوالہ ہے۔ اب تو اس بنیاد پر ایک عالی شان قصر تعمیر ہو چکا ہے۔

1- برفاب (نظمیں PEN2006 ایوارڈ یافتہ)

2- چاک سے اترے وجود (غزلیں نظمیں، 2009، پروین شاکر عکسِ خوشبو ایوارڈ یافتہ)

3- گرہ کھلنے تک (نظمیں 2013)

4-- خوابشار (غزلیں 2018)

''برفاب'' ہو کہ ''چاک سے اترے وجود'' شہزاد نیر کی ''گرہ کھلنے تک'' یا پھر ''خوابشار'' ہو، فنی حسن اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ گرفتاری کی بہت سی وجوہات میں ایک وجہ موضوعات کا تنوع ہے۔ آپ نے نہ صرف روایتی مضامین برتے ہیں بل کہ سماجی، معاشی، سیاسی و معاشرتی رویوں کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یوں آپ کا کلام آپ کے عہد کا آئینہ بن گیا ہے۔

آپ کو شاید یہ ابتدائیہ اس مضمون کے حوالے سے اضافی محسوس ہو لیکن میرا مقصد شہزاد نیر کے ادبی قد کاٹھ، ریاضت، رجحانات اور نظامِ فکر کا اشارتاً ذکر کرنا ہے۔ اس سبب سے ''کہانی چل رہی ہے'' کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ سہل ہو جائے گا۔

یہاں پر فقط چند اشعار اور کچھ نظموں کے عنوانات درج کیے دیتا ہوں:

تمہارے پاؤں جمے ہیں سو تم نہ سمجھو گے
حیات کیسے گزرتی ہے لڑکھڑاتے ہوئے

....

مجھ کو کسی بھی حال میں خلقت کے ساتھ رکھ
جن کو خدائی چاہیے، اُن کو خدائی دے
خدائے ارض میں بیٹی کے خواب کاٹ سکوں
تُو میرے کھیت میں اتنی کپاس رہنے دے

.....

جا کسی اور سے لے نسبتِ افلاک میاں
ہم زمیں زاد فقیروں سے یہ کیا مانگتا ہے

.....

آپ نے دیکھا کہ شہزاد نیر ادب برائے زندگی کے نمائندہ ہیں۔ اس نمائندے نے اب کے وسیلہ اظہار مائکرو فکشن کو بنایا ہے۔ یہ بناؤ سنگھار پچھلے پچیس تیس سال سے جاری ہے۔ یہ کاوش شعوری نہیں تھی۔ پیش لفظ میں وہ رقم طراز ہیں۔
''چلتے چلتے کسی کہانی سے ملاقات ہو جاتی تو میں ٹھٹک کر رہ جاتا۔ میری تو نظموں غزلوں سے شناسائی ہے یہ کہانیاں کیوں کر مجھے ملنے کو چلی آتی ہیں۔ میں نظریں چرا کر گزر جاتا''
شہزاد نیر نے کہانیوں کو مائکرو فکشن کے قالب میں کیوں ڈھالا۔ کیا انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ موجودہ عہد میں توجہ کا دورانیہ سمٹ کر بہت کم رہ گیا ہے؟
کہا جاتا ہے کہ خیال اپنی صنف کا انتخاب خود کرتا ہے۔
''ایک دن میں لکھنے بیٹھ گیا ارے ----- یہ تو بہت جلدی ختم ہو گئی۔ میں نے ختم ہو چکی کہانی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ سو اُتنی ہی لکھتا جتنی وہ ہوتی۔ جہاں کہانی اختتام کا موڑ مڑ جاتی وہیں قلم رکھ دیتا''
راکب راجا صاحب کا ایک شعر یاد آیا:
ہم غیر ضروری باتوں کو تحریر بھلا کب کرتے ہیں
ہم شاعر لوگ مورخ ہیں تاریخ مرتب کرتے ہیں

.....

افسانوی نثر میں مائیکرو فکشن یا مائیکرو ف جدید صنف ہے۔ جدید اس لحاظ سے کہ پچھلے کچھ عرصے سے باقاعدہ اس نام سے پکارا، لکھا اور پڑھا جانے لگا ہے۔ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مختصر کہانی ماضی میں بھی لکھی جاتی رہی تاہم لکھنے والوں نے اسے اپنے سخن میں مرکزی اہمیت نہیں دی۔ نجیب محفوظ، خلیل جبران، جوگندر پال اس سلسلے کے اہم نام ہیں۔ اردو زبان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اسے سعادت حسن منٹو جیسا طاقت ور ادیب میسر آیا۔ منٹو تقسیم برصغیر جیسے بڑے تجربے سے گزرا۔ بٹوارے سے وجود پذیر ہونے والی کہانیوں کو جہاں اس نے افسانوں میں سمویا وہاں اس کریدنا کی کو افسانچوں میں ایسا تصویر کیا کہ آج بھی ''سیاہ حاشیے'' کی اہمیت مسلّم ہے۔
جس طرح چھوٹی بحر میں شعر کہنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے یہی معاملہ مائکرو فکشن کا ہے۔ دیکھنے میں تو فقط چند سطریں ہی ہیں لیکن بات کو اس ڈھنگ سے کہنا کہ قاری تک بنا کسی ابہام کے ابلاغ ہو اور فنی تقاضے اور حسن بھی برقرار رہے، ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے۔
ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد مائکرو فکشن ایک صنف کی صورت اختیار کر چکا ہے تو یقیناً

ناقدین نے کچھ حدود و قیود بھی متعین کی ہیں۔
''ایسی کہانیاں جن میں واحد تاثر کی شدت ہو اور وہ ایک انکشاف کی مانند کہانی کے آخر میں پھٹ پڑے۔ وہ قاری کو ہنسا دے، رلا دے، اسے اندر سے سخت مضطرب کر دے یا اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کو کھول دے۔''
ناصر عباس نیر:
''کہانی چل رہی ہے'' کی کہانیاں لکھتے ہوئے شہزاد نیر کے پیش نظر یہ نکات رہے ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کتنی کہانیاں اس تعریف پر پوری اترتی ہیں۔ جتنی کہانیاں کتاب میں شامل ہیں میرا خیال ہے اتنی نہیں ہونی چاہیے تھیں کہ اس سے مجموعی تاثر کے زائل ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ بہت اچھی کہانیاں کم اچھی کہانیوں میں دب سکتی ہیں۔ خیر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے یہ تو مصنف کی صوابدید تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ وہ مائکرو فکشن کا بھرپور تعارف پیش کروانا چاہتے تھے۔
کتابی صورت میں آنے سے پہلے کچھ کہانیاں ادبی جرائد ''لالٹین'' ماہنامہ تخلیق، ماہنامہ بیاض، روزنامہ ایکسپریس اور اُردو ویب سائٹ ''ہم سب'' پر شائع ہوئیں۔
کتاب میں شامل کہانیوں کی تعداد ایک سو چوالیس ہے۔ ایک ایک پر بات کی جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔ جس کا فی الحال میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ البتہ میری فکاہیہ مضامین اور خاکوں پر مشتمل کتاب ضرور زیر ترتیب ہے!
''کہانی چل رہی ہے'' کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد یہ سامنے آیا کہ تخلیق کار نے کسی ایک خاص اسلوب کو نہیں برتا اور نہ ہی کہانیاں کسی ایک موضوع کے گرد گھومتی ہیں۔ کہیں بیانیہ، کہیں ڈرامائی، کہیں مکالماتی تو کہیں علامتی رنگ ہے۔ ایسا کرنے سے ایک تو لکھنے والے کی فنکارانہ وسعت واضح ہوئی دوسرا قاری یکسانیت کی نیند آور دوا سے محفوظ رہا۔ فہرست تو میں نے اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام کہانیوں کی تیار کر رکھی ہے لیکن ساری فہرست نقل کرنا ممکن نہیں۔ پانچ پانچ ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔
بیانیہ اسلوب: چارج، تقویٰ، لائن کلیئر، دو ہزار بندے، صلہ رحمی
ڈرامائی اور مکالماتی اسلوب: میڈیا منڈی چینل ون اور ٹو، اوجھل ہاتھ، قطرہ قطرہ زہر، الٹرا ساؤنڈ، قانون کے سامنے
علامتی اسلوب: وقت کی قید سے رہائی، قصۂ یک درویش، مطالعہ آزاد کرتا ہے، جوان موت، پاکستان زیادہ تر کہانیاں بیانیہ اسلوب میں ہیں۔ ایک دو جگہ بائبل اور قرآن حکیم کے ترجمے کا سا انداز اپنایا گیا ہے۔ تین کہانیاں ماخوذ ہیں۔
کھیت کی مچھلی، شراکت کا دھوکہ، گزارا
نیّر صاحب نے مقامی دانش کے رنگ میں ان کہانیوں کو ایسا رنگا کہ طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔
اب آتے ہیں موضوعات کی طرف جو ہمارے

اطراف سے لیے گئے ہیں۔ لیجیے کھوجتے سے معلوم ہوا کہ یہ تعداد میں گیارہ ہیں۔

1 مذہبی شدت پسندی

2 دوہرے رویے

3 جدید ترین مسائل

4 تقسیمِ ہندوستان

5 ریاستی جبر

6 سماجی حبس

7 جنسی و اخلاقی مسائل

8 بھوک کی پروردہ کہانیاں

9 فوجی ماحول

10 تھانہ کلچر

11 رومان

زیادہ تر عنوانات تو آسانی سے طے پا گئے۔ ایک دو نے مجھے بہت دیر تک الجھائے رکھا کہ کہانیوں کی بنیاد کسے قرار دیا جائے۔ قرار اس لیے نہیں آتا تھا کہ کہیں تشخیص میں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ کہانیاں زیادہ تر جنس، جنسی بے راہ روی اور غمِ روزگار سے متعلق ہیں۔ کہیں روزگار کی عدم دستیابی کہانی کو جنم دیتی ہے تو کہیں طویل عرصے تک پردیس میں قیام امتحان کا موجب بنتا ہے۔ بہر حال اپنے دانست کے مطابق انھیں کسی ایک طرف کر دیا ہے۔

دراصل یہ پیچیدگی سماجی ساخت کو ظاہر کرتی ہے۔ ظاہر ہے ہر کہانی کا محرک مختلف ہوتا ہے۔ تیر صاحب کا کہنا ہے۔

"اس کتاب کی بہت سی کہانیاں خالص تخیل، کچھ مبنی بر واقعہ اور کچھ دونوں کا آمیزہ"

چلیے اب ہر عنوان کے تحت صرف ایک کہانی دیکھتے ہیں۔

1 مذہبی شدت پسندی:-

کتاب میں شامل تمیں سے چالیس فیصد کہانیوں کا موضوع یہی ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے کہ یہاں سب سے زیادہ واقعات اسی سبب رونما ہوتے ہیں۔ اس موضوع کو اتنی اہمیت دینا لکھاری کی اپنی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے - مذہب کے نام نہاد علم برداروں نے نہ صرف دوسرے مذاہب بلکہ اپنے ہم مذہبوں کا جینا بھی دشوار کر رکھا ہے۔ نوجوان نسل کی مذہب سے دوری کی بڑی وجہ یہی شدت پسند رویہ ہے۔

"آبگینہ ٹوٹ گیا" ایک متفکر نوجوان کی کہانی ہے جسے ایسے واقعات دل گرفتہ کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا کہ لوگ صرف اپنی رائے کو ہی کیوں حرف آخر سمجھتے ہیں۔ اُس روز بھی یہی ہوا کہ کسی نوجوان نے علی الاعلان دوسرے عقیدے سے تعلق رکھنے والے انسان کو قتل کر دیا۔ ہر طرف پذیرائی ہونے لگی۔ اس کا دل رنج و ملال سے بھر گیا۔ قریبی مسجد سے آتی وعظ کی آواز سن کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ سکون کی تلاش میں وہ مسجد جا پہنچا۔ کچھ وقت ہی گزرا ہوگا کہ مولانا نے قتل کو مقدس ٹھہرا کر قاتل کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔

آخرکار----

"دل ڈوبنے لگا تو وہ گھبرا کے نماز پڑھے

بغیر ہی مسجد سے نکل آیا"

ایسی کہانیاں جھنجوڑ کے رکھ دیتی ہیں بشرطیکہ آپ درد دل رکھتے ہوں۔ افسانے کا نام اور پنچ لائن شاندار ہے۔ دو تین جملے اضافی محسوس ہوتے ہیں۔

2 دوہرے رویے:۔

ہمارا انفرادی اور اجتماعی دوغلا پن کتاب کا دوسرا بڑا موضوع ہے۔ تیسری دنیا میں ہمارا شمار یونہی تو نہیں ہوتا۔ ان کہانیوں میں زیادہ تر مذہبی منافقت کو آشکار کیا گیا ہے لیکن یہاں ہم جس کہانی کو زیر بحث لائیں گے وہ "برادری سے باہر ہے"۔

عاصمہ کو گھر سے نکلوانے برادری کے لوگ بشیر کے پاس آتے ہیں - آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمھاری بیوی تمھاری غیر موجودگی میں رات گئے خاور کے کمرے سے نکلتی دیکھی گئی ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ وہ عاصمہ کو سب کے سامنے بلا کر پوچھے لیکن بشیر ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

"مجھے خدا سے حیا آتی ہے کہ اُسی غلطی کی کسی اور کو سزا دوں جو خود میں نے بھی کی ہو۔

"بشیر تم مرد، عورت کو ایک ہی پلڑے میں رکھ رہے ہو؟ مردوں سے تو یہ کام ہو ہی جاتے ہیں۔ چلو اُٹھو بھائیو یہ نامرد ہو گیا ہے۔ اعلان کر دو کہ بشیر برادری سے باہر ہے"

3 جدید ترین مسائل:۔

یہ کہانیاں اس دور کے المیے ہیں۔ ان کی جڑ میں سرمایہ دارانہ نظام کارفرما ہے۔ کہیں میلوں پر پھیلے گولف کورس تو کہیں ایک ایک کمرے میں دس دس نفوس رہائش پذیر ہیں۔ ان کہانیوں میں نہ نہ کرتے آٹھ سے دس جدید مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کیا ہے کہ خسارہ تو خسارہ ہی ہوتا ہے لیکن جو گھاٹا "ڈیجیٹل انسان" ہونے سے ہوا پورا ہونے کو نہیں آتا۔

بک سے فیس بک تک کے سفر میں انسان کہیں کھو گیا ہے۔ سوشل میڈیا کمنٹس کی بھرمار میں---

"دعا میں خلوص، تعزیت میں رقت، افسوس میں دکھ، خوشی میں مسرت--- کچھ بھی نہیں بچا یہ میں ہوں ---- جو نہیں رہا"

4 تقسیم ہندوستان:۔

یوں تو اس واقعے کو اُناسی سال ہو گئے ہیں لیکن اب بھی راکھ سے کوئی چنگاری جل اٹھتی ہے۔ رفتگاں نے اس پر بہت لکھا لیکن ہنوز بہت سی کہانیاں تشنۂ اظہار ہیں۔

ان میں ایک کہانی "گلوبل سیٹیزن" کی ہے۔ جس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ بچپن پاکستان میں گزرا۔ جوانی بنگلہ دیشی ہو کر گذر گئی اور پھر" وہاں مزید الجھ گئی تو انگلینڈ آ بسی۔ مجھے انگلستان کی شہریت ملی تو گویا انگریز بن گئی۔ بس ایک دن میں نے شناخت کے اس گورکھ دھندے پر لعنت بھیجی اور دنیا کی شہری بن گئی۔ یونو گلوبل سٹیزن"

5 ریاستی جبر:۔

جہاں ریاستی قوانین کی پاسداری ہر شہری پر

لازم ہے وہاں ریاست پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ شہریوں کو آزاد فضا مہیا کرے۔ ریاست جب تالی ایک ہاتھ سے بجانا چاہتی ہے تو چاہتے نہ چاہتے زبانوں پر سوال مچلنے لگتے ہیں۔ جواب دینے کے بجائے جب سوال اٹھانے والوں کو اٹھایا جاتا ہے تو کہانیاں جنم دیتی ہیں۔

''زیرِ زمین سے آتی آوازیں'' یہی تو ہیں۔ زیرِ زمین تنہا کمروں میں مقید افراد سے ایک شخص روز خطاب کرتا پھر کہتا کوئی سوال پوچھو وہ کچھ نہیں پوچھتے _ جانتے ہیں سوالات بے فائدہ رہیں گے۔ ایک دن کے لیے مزید انہیں کال کوٹھڑیوں میں قید کر دیا جاتا ہے۔

6 سماجی جبس:۔

مشرقیت پر ہمارے بڑوں کو بڑا ناز تھا۔ ہم نے ناک کٹوا دیا۔ کبھی بہن بیٹی سارے محلے کی بہن بیٹی ہوا کرتی تھی۔ منہ بولے رشتے عمر بھر نبھائے جاتے تھے۔ کبھی ہم ایک دوجے کے کندھے پر سر رکھ کر رو لیتے تھے اور اب ''رکے ہوئے آنسو'' بہانے کے لیے فوتیدگی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

''گلی میں گلی قنات کے پیچھے سے عورتوں کے رونے کی آواز سن کر وہ بھی رونے والیوں میں شامل ہوگئی۔ ذرا بحال ہوئی تو اٹھ کر چل پڑی۔ گلی میں ایک عورت کے پوچھنے پر کہ کون فوت ہوا ہے وہ لاجواب ہوگئی۔

''اسے واقعی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کی وفات پر رو آئی ہے۔ اسے تو کسی بہانے اپنے رُکے ہوئے آنسو بہانے تھے جو چھوٹے بڑے دکھوں کی صورت جمع ہوتے رہے تھے۔ گھر میں تو کوئی کھل کے رونے بھی نہیں دیتا۔''

7 جنسی و اخلاقی مسائل:۔

اخلاقیات کا تقاضا تب تک ہی کیا جا سکتا ہے جب تقاضے پورے کیے جا رہے ہیں۔ نہیں تو ''ممی'' بن کر بھی منزل کھوئی رہ جاتی ہے۔ خاوند کو پردیس گئے تین سال ہو گئے۔ گئے ہوئے کی امانت کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت حیلے کیے۔ ماں سے کہا تو وہ کہنے لگی

''میں نے جوانی کی طلاق بھگتی ہے۔ جانتی ہوں کہ تمھیں کون سی آری کاٹ رہی ہے''

ماں نے کپڑا لے کر بازوؤں، ٹانگوں، کمر اور سر پر کس کے لپیٹ دیا۔ کچھ راتیں تو ممی بن کر کٹ گئی لیکن

''پھر ایک رات میں نے ساری پٹیاں اتار پھینکیں--- اور ساتھ ہی سارے کپڑے بھی----- تم سن رہے ہو نا؟ یا سو گئے؟ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں بیوی کے بجائے عورت بن گئی۔ محض عورت''

بلا شبہ شاہکار افسانچہ ہے۔ شہزاد نیر کا فن اپنے جوبن پر ہے۔ یقیناً آپ جوبن کا نظارہ کرنا چاہیں گے۔ اس کا تقاضہ ہے کہ کتاب پڑھیں۔

8 بھوک کی پروردہ کہانیاں:۔

بھوک جب حد سے بڑھ جائے تو بات بگڑ

جاتی ہے۔ بگڑے ہوئے حالات سنوارنے کے لیے بھوکا ہر روپ دھارنے کے لیے تیار ہوتا ہے چاہے اُسے "سینۂ شب" سے گزرنا پڑے۔

شاید ہی کوئی دفتر ایسا ہو جہاں عصمت نے نوکری کی درخواست نہ دی۔ ایم اے کیے تیسرا سال تھا۔ بیوہ ماں اور جوان بہن کی ذمہ داری اس کے سر اور واحد سہارا ابا (مرحوم) کی پنشن۔ آخر ایک دن ماں کو خوشخبری سنائی کہ کام مل گیا ہے۔ دن نکلنے سے پہلے گھر آجایا کروں گا۔ پیسا آنا شروع ہوا تو ماں بیٹی کا جہیز جمع کرنے میں لگ گئی۔ ایک رات بازار سے واپس آتے خاصی دیر ہوگئی۔ رکشہ خراب ہوا تو اتر کر پیدل چلنے لگیں کہ

"کانوں میں کسی زنخے کی آواز آئی باجی اللہ نے تجھے بہت دینا ہے۔

ماں نے چونک کر دیکھا منہ پر بے تحاشہ میک اپ تھوپے ہیجڑوں کے سے لوچ دار لہجے میں بھیک مانگنے والا اس کا اپنا عصمت تھا۔ اسے زور کے چکر آنے لگے۔ بہن اور بھائی کے سنبھالتے سنبھالتے ماں زمین پر گر گئی۔"

اس اختتام نے تو اخیر ہی کر دی۔ شہزاد نیر صاحب آپ کے قاریوں میں کوئی دل کا مریض ہوا تو پھر--- اور یہ اہم نکتہ بھی یاد رہے کہ ماں اپنے بیٹے کی آواز ہزار آوازوں میں پہچان لیتی ہے!

9 فوجی ماحول:۔

فوج اس ملک کا اہم ادارہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر اہم واقعہ انہی کی پیش کش ہوتی ہے۔ کشمکش فوجوں میں چلتی رہتی ہے۔ رہتے جو ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔

اس کہانی میں جو "جان بچانے کی خاطر" ہوا وہ دونوں اطراف کے لیے مثبت رہا۔ آمنے سامنے پہاڑی چوکیوں پر تعینات دو فوجی نیچے نالے میں گھومتے بچھڑے کو کتوں سے بچاتے ہیں۔ دونوں کا ہدف مشترک ہوتا ہے۔ اس اشتراک سے پہلے "ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن ظالم کتوں سے مظلوم بچھڑے کی جان بچانے کے لیے دوست بن گئے تھے"

کیا حسین بات ہے کاش--- لیکن نہیں کشمکش ہی تو جواز ہے۔

کہانی یہاں ختم ہو جاتی تو خوب صورت افسانچہ تھا لیکن شہزاد صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک اور بات بھی کر دی۔ وہ اور بات ہے تو اچھی مگر اضافی ہے۔

10 تھانہ کلچر:۔

یہ وہ کلچر ہے جس کی توصیف نہیں کی جاسکتی۔ کی تو تب جائے جب یہ جائے امان ہو۔ اب ایسا بھی نہیں کہ یہاں سنی ہی نہیں جاتی۔ جاتی ہے لیکن ان کی جن کے ہاتھ قانون سے لمبے اور آواز ہجوم سے اونچی ہو۔ بصورت دیگر آپ ایک سے دوسرے کے "چارج" پر منتقل ہو جاتے ہیں۔

یہ کہانی ایک باپ کی ہے جس کا جوان اکلوتا بیٹا ملک صاحب کے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ ملک صاحب ایف آئی آر کٹنے

نہیں دیتے۔ الٹا تھانیدار مقتول کے باپ سے معافی نامے پر انگوٹھے لگوالیتا ہے۔ پھر کیا تھا باپ نیم پاگل ہوگیا

''تب سے اس کا دن یہی گزرتا ہے۔ بالکل بے ضرر ہے۔ ہمارے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتا بس کہ سڑک بھی پار نہیں کرتا۔

آنے والے کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر جانے والا مسکرایا۔ یار پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہی سمجھ لو کہ اسے بھی تمھارے چارج میں دے کر جارہا ہوں''

پوری کتاب میں اس ماحول کی عکاس صرف یہی ایک کہانی ہے۔ ایک ہی کافی ہے۔ شدت احساس اس کہانی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کسی کا زندگی بھر کا احتجاج کسی دوسرے کے لیے محض معمول کی بات۔

11 رومان:۔

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک سو چوالیس کہانیوں میں فقط ایک کہانی رومانوی ہے۔ خیر آخر آپ کی ''پھولوں کے ڈھیر'' پر نظر تو پڑی۔ وجیہہ نوجوان جو دیکھنے میں جنگجو نظر آتا ہے اُس کی نظر ایک موچن پر جا ٹھہری۔ یہاں تک تو حیرت کی بات نہیں کہ کمبخت عشق ذات نہیں پوچھتا۔ حیرانی تو تب ہوئی جب اس کے دوستوں نے بتایا ''یہ اس کی جوتیاں چومتا ہے''۔

اس نے بھی تائید کردی۔ کہنے لگا وہ بھی منع کرتی ہے کہتی ہے'' جو چاہے چوم لے۔ ایک پاؤں نہ چوم دوسرے جوتی نہ چوم''

اس نوجوان کا کہنا ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

''یکا یک مجھے اس بندوق بردار کے دل میں پھولوں کے ڈھیر دکھائی دینے لگے''

صحیح کہتے ہیں ایک ایک گیارہ ہوتا ہے۔ ایک ایک کرتے گیارہ کہانیاں تو میں نے آپ کو پڑھا ڈالیں۔ چاول کا ایک دانہ چکھنے سے دیگ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ مجموعی تعداد کے حساب سے یہ ایک دانہ ہی بنتا ہے۔

شہزاد نیر نے کہانیوں کو افسانچہ نہیں کہا۔ مائکرو فکشن کہہ کر وہ بہت کچھ یکجا کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ میں جب افسانچہ کہتا ہوں تو اس میں پنچ لائن کا اطلاق ضروری سمجھتا ہوں۔ ''ایک انکشاف کی مانند جو کہانی کے آخر میں پھٹ پڑے''اس معیار پر آپ کی بہت سی کہانیاں پوری اترتی ہیں۔ چند کہانیوں کا انجام تو اس قدر دردناک ہے کہ دل جل کر کباب ہوجاتا ہے۔

سینہ شب، کوکھ کی بیداری، مکان کا درد، قحط نے بچہ کھایا، قراقلی، ناشنیدہ دس کے قریب کہانیوں کے عنوانات انگریزی زبان میں ہیں۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ادب میں زبان کے معاملے میں متعصب نہیں ہیں۔ یعنی زبردستی اردو کا جامہ نہیں پہنایا۔ پہناتے بھی کیسے کہ ایک تو اب یہ ہماری روزمرہ کا حصہ ہے دوسرا مؤثر ابلاغ کے لیے ناگزیر ہے تیسرا ان کا تعلق ہماری جدید زندگی سے ہے۔

چارج، لائن کلیئر، ڈیجیٹل انسان، گولف

کورس، سپلائی اور ڈیمانڈ، تھینک یو، گلوبل سٹیزن، پلازما گولڈ، الٹرا ساؤنڈ، میڈیکل ریپ کہانیوں کی صنف، موضوعات اور عنوانات کو پرکھنے کے بعد اب ہم اِن فن پاروں میں زبان کی خوب صورتی تلاش کرتے ہیں ادبی شان لیے ہوئے چند جملے دیکھیے۔ ایسے جملے آپ کو جا بجا ملیں گے۔

ہم چاروں بہنیں دھریکوں کی طرح بڑھ رہی تھی (کہانی چل رہی ہے)

میں کہوں گا تم سنو گے پر یقین تم کو نہیں آوے گا (قصہ یک درویش)

اس دھندے کے پھندے میں ایسے پھنسے کے قدم سکول جانا بھول گئے (سپلائی اور ڈیمانڈ)

اتنے آنسو بہانے کے باوجود دادی ان تیرہ سالوں کو نہ بہا سکی (بڑھاپے میں بچپن)

دہرا بدن، گھنی سیاہ لمبی مونچھیں داڑھی پر سوار تھیں گویا معاہدۂ امن کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہ رہی ہوں (دو دنیاؤں کا فرق)

ہمارے دل کانوں میں دھڑکنے لگتے ہیں (زیرِ زمین سے آتی آوازیں)

بعض جملوں میں لفظی مماثلت کو کس ہنر مندی سے استعمال کیا گیا ہے۔

کپڑا تان کر سائبان سا بنا تا ہے (چارج)

کسی کی انگریزی شستہ تو کسی کی شکستہ (گلوبل سٹیزن)

بچھڑا شاید بچھڑ کر اس طرف آ نکلا تھا (جان بچانے کی خاطر)

تیری آنکھوں کے سامنے بچی سے بچوں والی ہوئی ہوں۔ مجھ پر ظلم نہ کر (ایمان کا پہلا درجہ)

کروٹ پہ کروٹ بدلتی ہوں لیکن کسی کروٹ چین نہیں پڑتا (ممی)

ایسے خوب صورت الفاظ بھی پڑھنے کو ملے جو اب بولے کم کم جاتے ہیں۔ ان کی پزیرائی بھی ضروری ہے۔

پھبتیوں، سائبان، بیساواؤں، ارتعاش، گداگروں، دل پسیج گیا، تکریم، استغراق، منکشف، آلتی پالتی

کتاب کے آخری حصے میں پانچ افسانے بھی شامل ہیں۔ کچھ کالج کے زمانے اور کچھ بعد کی یادگار ہیں۔ یادگار کا نظارہ کیجیے۔

اپنا خون:۔

یہ ایک بے اولاد جوڑے کی کہانی ہے۔ جو سینتالیس کے مہاجر ہیں۔ راجپوتانہ شان سے زندگی گزارتے ہیں۔ ابتدا میں راؤ صاحب نے اپنا بھتیجا لے کر پالا لیکن وہ سہارا بننے کے بجائے دسویں میں فیل ہونے کے بعد سارا زیور لے کر بھاگ گیا۔

''تمہاری خالہ کہتی تھیں، اپنا خون سمجھ کے رکھا تھا، وہ تو اپنا خون تھا ہی نہیں جو یوں دغا دے گیا''۔

افسانے کا راوی، راؤ صاحب کی شفقت سے متاثر ہو کر ان کے قریب ہو جاتا ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک بیٹے کا کردار بخوبی ادا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ راؤ صاحب کی وفات

پر تدفین کے تمام انتظامات بھی یہی لوگ کرتے ہیں - عدت گزرنے کے بعد راؤ صاحب کی بیوہ سے جب یہ کہا جاتا ہے

''میکہ آپ کا ہے نہیں اور دیور تو وہ کہ راؤ صاحب کی وفات کے تین دن بعد آیا اور اسی دن واپس چلا گیا- وہاں کون آپ کو سنبھالے گا مگر وہ بولیں وہ اپنے رشتہ دار تو ہیں---اب بری یا بھلے وہیں کٹے گی--- اپنا خون پھر اپنا ہوتا ہے''-

افسانے کا یہی غیر متوقع انجام اس کا جواز ہے- ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خالہ جان رشتہ داروں کے ہاں جانے کے بجائے یہاں رہنے کو ترجیح دیتیں لیکن انھوں نے احساس کے رشتے پر خون کے رشتے کو فوقیت دی- وہی رشتہ جس نے عمر بھر انہیں پوچھا تک نہیں- ایسا اس لیے ہوا کہ خالہ جی کے پیشِ نظر یہی سوچ تھی کہ اپنا مارے بھی تو سائے میں پھینکتا ہے- سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سچ مچ اپنا ہو تو مارے ہی کیوں- کیوں نہ اب ہم اس نقطۂ نظر میں ترمیم کر کے انسانیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں-

افسانے کا اسلوب انتہائی سادہ ہے یہی سادگی اس کا حسن ہے-

روحوں کا ملن:-

یہ کیسا افسانہ ہے جو حقیقت سے زیادہ افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے لیکن قاری کو روح تک سرشار کر دیتا ہے- بنیادی طور پر دو پیار کرنے والوں کے درمیان حائل ذات برادری کی دیوار کو موضوع بنایا گیا ہے- افسانے کے ہیرو ہیروئن اس دیوار کو گرانے کے بجائے اس کے خود بخود گر جانے کا انتظار کرتے ہیں- یہی نقطہ اس کہانی کو منفرد کر دیتا ہے-

افسانے کی ہیروئن دیبا اپنے محبوب کو بیالیس برس بعد کچھ یوں خط لکھتی ہے-

''ڈیئر عدیم

ہماری زندگی گزارنے والے سب لوگ جا چکے ہیں- آجاؤ کہ اب اپنی زندگی ہم بھی گزار لیں---- دیکھو روح پر بڑھاپا نہیں آتا

تمہاری دیبا''

اس جدید عہد میں بھی ذات برادری کی یہ دیوار اتنی خستہ نہیں ہوئی کہ مستقبل قریب میں مکمل منہدم ہو جائے- خیر عدیم اور دیبا جیسا رویہ اپنا کر زندگی کو مزید اجیرن ہونے سے بچایا جا سکتا ہے-

افسانہ خوب صورت رومانوی فضا لیے ہوئے ہے-

دو دنیاؤں کا فرق:-

یہ افسانہ عین حقیقت ہے- کہانی یوں ہے- ایک برخوردار کے ابا اور نانا جان یہ چاہتے ہیں کہ بچے کو سکول سے اٹھا کر مدرسے میں بٹھایا جائے- جہاں وہ دینی تعلیم سے بہرہ ور ہو-

''بیٹی یہ تو دنیاوی علم ہے یہیں رہ جائے گا- اگلے جہان میں تو ساری عزت دینی علم والے کی ہوگی-

نانا جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اماں سے کہا

"میرا تو اپنا خیال ہے کہ حافظ قرآن بن جائے" ابا جان بولے
گھر میں صرف اماں جان ہیں جن کا خیال مختلف ہے۔ اس اختلاف کے باوجود بچے کو مدرسے بھیج دیا جاتا ہے۔ پہلے ہی دن ایک معصومانہ خطا کے سبب مولوی صاحب پوری طاقت سے مولا بخش بچے کی کمر پر جڑ دیتے ہیں۔ اگلے ہی لمحے بچہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ دن تو وہ قریب ایک باغ میں گزارتا ہے مگر جب بھوک ستانے لگتی ہے تو گھر کو منہ کرتا ہے۔ ماں کا آنسو دیکھ کر سبب پوچھنا تھا کہ بچے نے قمیص اوپر کر دی۔ ماں کندھے سے پسلی تک گہرے گلابی رنگ کی ترچھی لکیر دیکھ کر لرز جاتی ہے۔ انجام کار اگلی صبح بچہ خوشی خوشی سکول جا رہا ہوتا ہے۔
نہ تو یہ موضوع نیا ہے اور نہ ہی اس موضوع پر یہ پہلا افسانہ ہے۔ اس واسطے قاری افسانہ پڑھ کر چونکنا تو در کنار حیران بھی نہیں ہوتا کہ بدقسمتی سے یہ عمل معمولی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ افسانہ نگار نے ابھی تو تصویر کا وہ پہلو دکھایا ہی نہیں جو زیادہ قابل گرفت ہے۔ یہ افسانہ لگ بھگ تیس پینتیس سال قبل تحریر کیا گیا ہے۔ مدرسے جیسے عظیم ادارے کے زوال کو سمجھنے کے لیے افسانہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔ کہانی میں کہیں بھی جھول نہیں ہے۔
دو پاٹن کے بیچ:-
کاش یہ کہانی صرف فکشن ہوتی لیکن یہ تو سچا واقعہ ہے۔ جسے تخلیق کار نے پوری سچائی کے ساتھ افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے۔
سلمٰی نامی خوبصورت لڑکی کو کرم الٰہی بہو بنا کر اپنے گاؤں لے آتا ہے۔ سلمٰی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ سگھڑ بھی ہے۔ وہ جلد ہی سب کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے یہاں تک کہ محلے بھر میں مقبول ہو جاتی ہے۔ سب کے کام کرنا، اوروں کا دل رکھنا اسے محبوب ہوتا ہے۔ کہتی ہے "سنا ہے کسی کا دل رکھنا بڑے ثواب کا کام ہے" سلمٰی کی اولاد نہیں تھی۔ دل بہلانے کو پاس پڑوس کے گھروں میں چلی جاتی یوں اس کی دوستی چوہدری نور بخش کی بیٹی نرگس سے ہو جاتی ہے۔ وہ اسے ہمراز بنا کر سلمٰی کے انکار کے باوجود اپنے محبوب ملک عطا اللہ کے بیٹے سے ملنے لگتی ہے۔ سلمٰی ان ملاقاتوں میں پہرہ دار ہوتی۔ ہوا یوں کہ ایک دن نذیر نائی نے دیکھ لیا۔ وہ اگلے روز چوہدری کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اپنی بیٹی کو تو اس نے چادر منہ پر ڈال کر گھر کی طرف بھگا دیا۔ سلمٰی کو دھر لیا گیا۔
"صبح سویرے مولوی مستقیم نے فتویٰ دے دیا۔ نذیر نائی نے جھٹ استرا تیز کیا اور سلمٰی کے سر کے سارے بال مونڈھ ڈالے۔ اس پر بدکاری کا الزام لگا کر اسے گلیوں میں گھمایا۔ چوہدری نور بخش اور اس کے دونوں بیٹے سلمٰی کو جوتے مارنے لگے۔ لڑکے بالے نعرے لگانے لگے سلمٰی تتھی ہائے ہائے۔۔ سلمٰی کتی ہائے ہائے"
اور ذلت کا بہت سا سامان۔۔۔ جسے پڑھتے

ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ پہلے تو خیال آیا کہ شاید افسانہ نگار نے انتہا کی مبالغہ آرائی کی ہے لیکن شہزاد صاحب کا کہنا ہے کہ بڑھانا تو ایک طرف کئی جملے حذف کرنے پڑے جو قابلِ تحریر ہی نہیں ہیں۔ افسانے کا انجام اسے مزید الم ناک بنا دیتا ہے۔

''شام کو ٹرالی شہر سے واپس آ گئی، سلمیٰ تھانے میں بند ہو گئی تھی اور سارا راستہ ٹرالی کو کھینچنے والا ٹریکٹر ملک عطاءاللہ کا وہی بیٹا چلاتا رہا تھا''۔

افسانے کی بنت بہت مضبوط ہے البتہ نام سے میں متفق نہیں کہ یہ کہانی کے مرکزی خیال تک رسائی نہیں دیتا۔ کہانی کا مغز چودھراہٹ کا دوہرا رویہ اور نذیر نائی جیسے بے شرم کردار ہیں۔

دھند میں دنیا:۔

عین ممکن ہے کہ پہلے قرآت میں کہانی آپ کے پلے نہ پڑے اور آپ کرداروں کے اس گورکھ دھندے میں الجھ جائیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ افسانے کا اسلوب اور کہانی باقیوں سے قدرے مختلف ہے۔ یہ کہانی ہے معاشرے کے اُن کرداروں کی جو بظاہر تو مذکر یا مونث ہوتے ہیں لیکن ــــ

''بڑی گڑبڑ ہے۔ تم لوگ جو نظر آتے ہو وہ ہوتے نہیں اور جو ہوتے ہو وہ دکھتے نہیں''۔

یہی کشمکش ان کے لیے اذیت کا باعث بنتی ہے اور ان کی دنیا ساری حیاتی دھند میں گھری رہتی ہے۔

افسانہ نگار نے جمیل (جمیلہ) اور حامد (خانم) کے کرداروں کی مدد سے اس نازک موضوع کو چھیڑا ہے۔

''ٹھیک؟ غلط ٹھیک کچھ نہیں ہوتا چودھری صیب ---- راس آنے کی بات ہے۔ جو چیز جسے سوٹ کر جائے ــــ وہ اس کا ٹھیک بن جاتی ہے اور جسے سماج کے زیادہ لوگ ٹھیک کہہ دیں وہ ٹھیک مان لی جاتی ہے''۔

افسانے کا خلاصہ دو چار سطروں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی میں کرنا چاہوں گا۔ آپ خود اسے پڑھیے۔ یقیناً یہ تکلف آپ کو ناگوار نہیں گزرے گا کہ شہزاد نیر نے اسے پوری فنی چابک دستی سے قلم بند کیا ہے۔

معروف نقاد اور افسانہ نویس امجد طفیل نے کتاب کی تقریب میں کہا تھا کہ اگر شہزاد نیر اسی طرز پر باقاعدہ افسانہ نگاری کرتے تو کامران ٹھہرتے۔

اردو ادب میں مائکرو فکشن کی صنف میں ''کہانی چل رہی ہے'' کی کہانی یاد رکھی جائے گی۔ جرات اور ہنرمندی سے لکھی گئی یہ کہانیاں قابلِ ستائش ہیں۔

''خواہش ہے کہ آنے والی نسلیں یہ نہ کہیں کہ ہمارے بڑوں نے اپنا عہد لکھنے میں مصلحت کی دیوار کے پیچھے پناہ لی''

میں نے تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے ایمانداری سے کام کرنے کی سعی کی ہے۔ کتنی صحیح کی ہے یہ تو ناقدین بتائیں گے۔ یوں بات سے بات نکلتی رہے گی جب تک ''کہانی چل رہی ہے''۔

☆☆☆☆☆

قطبِ طریقت حضرت خواجہ غلام قطب الدین فریدی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ غلام قطب الدین فریدی صاحبؒ سے میرا تعلقِ صادق چند دنوں، چند ہفتوں، چند مہینوں کا نہیں بل کہ یہ تعلقِ خاطر کم و بیش 25 برس پر محیط ہے وہ مرشدِ ارشد، صوفی باصفا، حبیبِ باوفا، عالمِ باعمل تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے لوگ مرتے نہیں ہیں۔

"مر کے بھی زندہ بذیرِ آسماں"

کے مترادف ہیں۔ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ آنے والا مورخ اِن خدمات کو قلمِ نورانی سے یاد کے نورانی اوراق پر نوری روشنائی سے رقم کرے گا۔ آپ نے یہ ترغیبی، تبلیغی اور اِصلاحی سلسلۃ الذہب لاہور سے شروع کیا۔

یہ بندۂ عاجز الحمدللہ علیٰ ذالک اول روز سے ہی ان کے ہمراہ قدم بقدم چلتا رہا۔ آپ نے اس مشکل ترین کام کو اپنی محنتِ شاقہ اور شبھ لگن سے کامیابی کے گگن تک پہنچا دیا۔

وہ اپنے اس کارنامے کو اپنی کوششوں کا سبب نہیں سمجھتے تھے بلکہ خواجگان چشت اہلِ بہشت کی توجہ اور اپنے صالحین، مرشدین کی دعاؤں کا ثمرہ سمجھتے تھے۔

حضرت خواجہ غلام قطب الدین فریدی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عزم، اپنے اِرادے اور اس مبارک مشن کی خدمت میں اتنے مضبوط اور سچے تھے کہ اِنھوں نے علالت تاماں میں بھی یہ سفر ملتوی نہیں کیا۔

ایک شعر با ادنیٰ تصرف:

پیدا کہاں ہیں ایسے درخشندہ طبع لوگ
افسوس ہم کو قطب سے صحبت نہیں رہی

....

اللہ کریم حضرت خواجہ غلام قطب الدین فریدی رحمہ اللہ علیہ کے درجات روز بروز بلند فرمائے اور اُن کے فرزندِ ارجمند صاحبزادہ نصیر الدین چراغ صاحب (مدظلہ العالی) کو جوان کے سجادہ نشین بھی ہیں ان کے ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

علامہ اقبالؒ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا:

جہاں میں اہلِ عرفاں صُورتِ خورشید ہوتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

....

کثیر تعداد میں مشائخانِ عظام، علماء کرام اور عشاقان کا تعزیتی ریفرنس میں جمِ غفیر اُن سے محبت اور اُن کے درجاتِ معلیٰ کا بے مثال ثبوت ہے۔

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

☆☆☆☆☆

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

کھڑکیوں سے جھانکتے گیت اور جوتے کا کنکر

یہ تب کی بات ہے جب لوگوں کے پاس ریڈیو بھی کم کم ہوتا تھا ٹین ایج تھی یا اس سے ذرا آگے کا قصہ اکثر کسی گلی سے گزرتے جوتے میں کنکر آ ٹپکتا کہ کھڑکیوں سے جھانکتے گیت وہاں سے آتی آواز کے ذریعے گھیر لیتے اب جیسے علامہ یعقوب انور نے کہا:

جان بچانا فرض وی ہویا
یار دی گلی وی لنگھنی ہوئی

....

کو زیرِ لب کرتے کھڑکی کا گیت جو ریڈیو پاکستان لاہور یا کسی اور اسٹیشن سے بجتا گانا سننے لگ جاتے کنکر چبھا اور گلی گیت سے جاگی اور ہم حیلہ ساز ہوئے۔ گیت کا آغاز ہی راہ روک لیتا:

تو جیسا بھی ہے سانوریا
تو جیسا بھی ہے سانوریا
میرے نینوں کو بھایا
میں نے من میں بسایا
تو جیسا بھی ہے سانوریا

....

شبنم محمد علی اور کھڑکی اپنے خواب کے لئے گاتی ہے--- آسرا، فلم کا مسرور انور کا لکھا اور نا لیلیٰ کی آواز میں نثار بزمی کی یادیں ہری کرتی اکساتی جسم کی مچھلیوں کو مخالف سمت میں تیرنے کو بغاوت کرواتی دُھن اپنے لہریے میں پروتی چلی جاتی-- ایسی خطرناک موسیقی کے جادو سے بچنا اور اپنی راہ لینا مشکل ہو جاتا اب مسافر گیت کے مکھڑے میں گم چلا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے نیچے پڑے بھینس کے گوبر پر سے ہی پھسل جائے سرت ہی نہ رہتی اور ابھی گیت کا پہلا دوسرا تیسرا چوتھا ستانزا آتا ہے:

تنویر قاضی

بیری جگ چاہے کچھ کہے تجھ کو
تجھ سے سانوریا پیار ہے مجھ کو
تجھے کجرا بنا کے نینوں میں چھپایا
تو جیسا بھی ہے سانوریا

.....

گیت کے قریب رہ کر سننا ہے اپنے کو بظاہر معصوم دکھانا ہے-- وقت رک سا جاتا ہم اس نغمے کا تجزیہ کرنے لگتے کہیں بھیتر سے آواز آتی اب اپنا رستہ ناپو مگر وہ گیت اس گلی سے گزرنے نہ دیتا جب تک اختتام پذیر نہ ہو جاتا اس خاص علاقے ہی میں رہنا جہاں وہ واضح سنائی دے ایسا لگتا یہ خود ساختہ ہیر درستے کی ڈالی گئی لے سر و تال کی گُنجھل سے نکلنا نہیں چاہتا:

میں بھی ذرا دیکھوں کیسے یہ زمانہ
کرتا ہے تجھ کو مجھ سے بیگانہ
میں نے تن من لٹا کے تجھے اپنا بنایا
تو جیسا بھی ہے سانوریا

.....

کیسا سندر اور عجیب سے تھا کہ گُت سپنی بن جایا کرتی اور بے چین و مضمحل مٹیار اپنے سجن سے بنتی کرتی کہ وہ بین نہ بجائے پر بین نہ بجے تو وہ اتھری سوانی کیسے ولی جائے گیسو گیسو کیوں کر بلما کو رجھائے-،، بین نہ وجائیں منڈیا میری گت سپنی بن جائے گی،،

وہ خوبصورت اُلجھن تا گہ تا گہ اور پھانسے کہ ریشمی لحات کا گولا مزید پیچدار ہو جائے ہیر وانجھی محبوبہ کے سنگ محو رقص ہے کھڑکی دھک سے بند ہوتی ہے پر پٹ تھوڑا کھلا رہ جاتا ہے-- گیت اس کے روئیں روئیں میں گردش کرتا پاؤں پاؤں چرکھڑی چرکھڑی گھماتا ہے-

مچھریا ہونا آسان نہیں کہ جل بن مچھلی ایک سانس ہے اور دوسرا نہیں ریت ریت جلنا اور پھر مچھیروں کا ڈر علاحدہ-- وہ تو خوش قسمتی ہے اگر ماہی مچھیرا بن جائے آخری ستانزا تو خود سپردگی کی انتہا کی ساحلی کیفیت میں ڈوب گیا ہے ساتھ میں گلی چلتے راہی کو لہر لہر سمیٹتے--

دغا نہیں دینا مجھ کو سانوریا
تڑپوں گی جل بن جیسے مچھریا
میں تو بن کے رہوں گی تیرے قدموں میں سایا
تو جیسا بھی ہے سانوریا

.....

اب وہ کنکر نوکیلا ہو گیا ہے جس کی چبھن سے لہو رسنے لگا ہے-

وہ جوتے پہنے گلی کی پہنائی میں گم ہو گیا ہے- کانچ کی چوڑیوں کی جھنکار میں کھڑکی بند ہو جاتی ہے -

☆☆☆☆☆

محمد نوید مرزا اور تنقید کے رنگ

محمد نوید مرزا محقق اور نقاد ہیں جنھوں نے تنقید کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ادبی شعور، تحقیقی بصیرت اور تنقیدی فکر نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے مختلف موضوعات، نظریات اور ادبی شخصیات پر مضامین تحریر کیے جن میں علمی سنجیدگی اور فکری گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریریں طلبہ اور محققین کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

ان کی کتاب تنقید کے رنگ اردو تنقید پر مبنی مضامین کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ادب کو مختلف زاویوں سے پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے، مصنف نے تنقید کے مختلف انداز اور رجحانات کو "رنگوں" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس تصنیف میں ادب کی فکری، فنی اور سماجی جہات کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کے ذریعے قاری کو ادب کے گہرے مفاہیم تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین میں اردو ادب کے مختلف موضوعات، ادبی نظریات اور ادبی شخصیات پر تنقیدی گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے ہر مضمون میں ادبی متن کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے پس منظر، فنی ساخت اور فکری جہات کو واضح کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب اور معاشرے کے باہمی تعلق کو بھی اجاگر کیا ہے، جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب صرف تخلیقی اظہار ہی نہیں بل کہ معاشرتی شعور اور فکری آگہی کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے-----

کتاب تنقید کے رنگ کی ایک اہم خصوصیت اس کا سادہ، رواں اور علمی اسلوب ہے۔ مصنف نے پیچیدہ تنقیدی مباحث کو بھی نہایت واضح اور آسان انداز میں بیان کیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب نہ صرف عام قارئین بل کہ طلبہ اور محققین کے لیے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔ ہر مضمون میں دلیل، مثال اور تنقیدی تجزیہ موجود ہے جو قاری کو موضوع کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اس کتاب کے مضامین قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ادب کو صرف پڑھ لینا کافی نہیں بل کہ اس کے فنی محاسن، فکری جہات اور سماجی پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب تنقید کے میدان میں ایک اہم اضافہ سمجھی جائے تو بیجا نہ ہوگا اور ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تنقید کے رنگ ایک ایسی تنقیدی تصنیف ہے جو اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہے اور قاری میں تنقیدی شعور کو بیدار کرتی ہے۔ یہی خصوصیت اسے قاری کے لیے ایک مفید اور اہم کتاب بناتی ہے-----

☆☆☆☆☆

کومل شہزادی

دلیلِ بخشش بہ فیضِ نسبت

دلیلِ بخشش کو میں نے جب سبیلِ بخشش کے ساتھ ملایا تو سبیل اور دلیل کا باہمی ربط تب کہیں جا کر سمجھ میں آیا۔ دو ہم قافیہ الفاظ کا برمحل استعمال ترکیبِ لفظ کی عمدہ مثال ہے جو ایک نعتیہ مجموعے کا عنوان بنی۔ تمہیدِ مزید کو آئندہ پر موقوف کرتے ہوئے بخشش کی دلیل کو مربوط کرنے کی سعی اور کوشش کرتے ہیں اگر چہ میرا تصور اس سے ذرا آگے اپیلِ بخشش کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں براہِ راست اپیل کا حق سلطان محمود چشتی صاحب اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ جسے وہ آنے والے دنوں میں ضرور استعمال کریں گے۔ ثبوت کے طور پہ یہ اشعار پیش کر رہا ہوں:

خلد جیسی بہار میں ہوں
جب سے اُنؐ کے دیار میں ہوں

رشک آئے نہ کیوں مجھے خود پر
روشنی کے حصار میں ہوں

ہے مسلّم اُنؐ سے نسبت کا ثمر
ٹوٹ کر اُنؐ سے بکھر جائیں گے ہم

حشر میں سلطانؒ ہم کو ہے یقیں
کالی کملی میں اماں پائیں گے ہم

بٹ رہا ہے روزِ اوّل ہی سے صدقہ نور کا
لے رہے ہیں بھیک محتاج وغنی اُس نُور کی

تجھ کو سلطانؒ ہو مبارک مدحِ سلطانؐ زمن
تیری قسمت میں لکھی ہے چاکری اُس نُور کی

طیبہ کی ضیاؤں سے منور رہے سینہ
آتا ہے شب و روز مجھے یاد مدینہ

ہے اسوۂ شبیرؓ ہی وہ اسوۂ رحمت
اُمت کے لیے خاص ہے بخشش کا قرینہ

تصورِ اقبال

نعت کے حوالے سے میرا اپنا ایک خاص نقطہ نظر ہے اور میں بارہا اس کا برملا اظہار بھی کر چکا ہوں (تحریری زبانی) نعت لکھی نہیں جاتی بل کہ نعت ہو جاتی ہے۔ نعت ہو کیسے جاتی ہے؟ جب ایک شاعر کو عطا کی سند ملتی ہے۔ عطا کی سند کس کو ملتی ہے؟ جس کے دل و دماغ میں نعت ہی نعت ہوتی ہے اور ہر وقت اس پر نعت کہنے کی دُھن سوار رہتی ہے۔ یہ دُھن کیونکر سوار ہوتی ہے؟ کہ جب ایک شاعر نبیؐ آخر الزماں محبوب یزداں کی محبت اور عقیدت اپنے دل میں بسا لیتا ہے اور عشق کی حد تک سرور دو جہاں، شاہ کون و مکاں کی ذات والا صفات کو محبوب اور مقدم رکھتا ہے۔

نعت گوئی کی سعادت ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتی۔ بے شمار خواتین و حضرات ایسے ہیں جنھوں نے اپنی اپنی فیلڈ میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اور ان کا شمار منجھے ہوئے شعرا اور شاعرات میں ہوتا ہے لیکن نعت لکھتے وقت اِن کا ہاتھ کانپ جاتا ہے اور خامہ ہے کہ رواں نہیں ہوتا، اس کے برعکس ایک کم پڑھا لکھا شخص (شاعر) جسے نعت کہنے کا اِذن ملتا ہے وہ بآسانی یہ دریا عبور کر جاتا ہے۔ ثابت ہوا قلم بھی اُس وقت ساتھ دیتا ہے جب قلب آمادہ ہو۔ بات اِذن کی ہو رہی ہے تو میرے ممدوح جناب سلطان محمود چشتی بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ چشتی صاحب پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے کہ وہ اس کے محبوب کی ثنا خوانی اور ثنا گوئی میں مگن رہتے ہیں۔ ایک نعت گو شاعر اگر خوش قسمتی سے ایک اچھا نعت خوان بھی ہو (یعنی سلطان ہو) اور پھر وہ بخشش کی دلیل پیش کرے تو یقیناً اس کا یہ عمل محبوب بھی ہے اور مقبول بھی۔ اِسی دلیل کے سہارے چند مزید مثالیں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

قدم قدم پر ہے سامان میری بخشش کا
یہ مغفرت کے بہانے حضورؐ بانٹتے ہیں

یہ کائنات بھی سلطان نبیؐ کا صدقہ ہے
کوئی یہ مانے نہ مانے حضورؐ بانٹتے ہیں

بدل جائے گی ایک دن اپنی قسمت
یہی سوچ کر اُنؐ کے در پر پڑے ہیں

محبت کا روشن دیا نقشِ پا ہے
ہمارے دلوں کی ضیا نقشِ پا ہے

سجائیں نہ کیوں کر سروں پر اِسے ہم
ہمارا تو قبلہ نما نقشِ پا ہے

.....

انتہائی سادہ، سلیس، رواں اور عام فہم

زبان میں اپنا بیان قلم بند کرنے کو ہم اگر نفاست کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ نفاست بھی ایسی جو سلاست اور نزاکت کے پہلو میں تلاش کی جا سکتی ہو اور جسے ادب آداب کے دائرے میں رکھا گیا ہو۔ سلطان محمود چشتی بخوبی جانتے ہیں اور انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ تصنع اور بناوٹ سے پاک کلام ہی یہاں بھی اور وہاں بھی قابلِ قبول ہے۔ حاضری اور حضوری کو درج ذیل اشعار کی صورت میں دیکھتا ہوں:

میرا بخت چمکے گا تاروں کی مانند
مجھے جب مدینے کا زینہ ملے گا

قلم اُنؐ کی توصیف کرتا رہے گا
ثنا کا مجھے جب قرینہ ملے گا

عجب نور ہے میرے شہرِ سخن میں
مدینے کی خوشبو ہے میرے چمن میں

ہیں رنگیں بہاروں کی صورت مناظر
ہوں جیسے کھلے پھول باغِ عدن میں

لیا جب بھی نامِ محمدؐ ادب سے
ضیابار ساری فضا ہو گئی ہے

پڑھی نعت احمدؐ تو دنیا نے دیکھا
میرے ساتھ خلقِ خدا ہو گئی ہے

مشکل نہ رہی کوئی اُس لمحہ مشکل میں
جب ہاتھ بڑھایا ہے سرکارؐ کی رحمت نے

کیوں جائیں کسی در پر کیوں مانگیں کسی در سے
جب اپنا بنایا ہے سرکارؐ کی رحمت نے

....

عہدِ موجود میں نعت لکھنے کی خواہش اور کوشش اور خاصی حد تک جستجو ہر دوسرا شاعر اپنے تئیں کر رہا ہے اور کسی حد تک اپنی اس سعی میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن جب نعت کو عقیدت و محبت اور نورِ بصیرت کے ترازو میں یا پلڑے میں رکھا جاتا ہے تو اس کا وزن از خود نہ چاہتے ہوئے بھی کم ہو جاتا ہے اور بعض صورتوں میں ایسا شاعر انتہائی تکلیف دہ مراحل سے گزرتا ہے جس کا خمیازہ اُسے شرمندگی اور درماندگی کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے (اللہ ایسی لغزش سے بچائے) بات پھر وہیں پر آ کر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ نعت لکھی نہیں جاتی نعت ہو جاتی ہے۔

''دلیلِ بخشش'' میں شامل نعتیہ کلام سرور و نور اور کیف و وجد کی آفاقی کیفیات کا مظہر اور اظہر ہے۔ اور اس لافانی کیفیت میں ڈوبنے والا قاری ہو یا سامع سرشار بھی ہوتا ہے اور بیدار بھی اور اس کا دل آباد بھی ہوتا ہے اور شاد بھی۔ ایسے میں کسی کا متاثر ہونا دوسری کیفیت کو ظاہر کرتا ہے اِسی حقیقت کو

مدِنظر رکھتے ہوئے اور نظریہ ءِضرورت کے تحت ''دلیلِ بخشش'' کی یہ زندہ جاوید مثالیں درج کر رہا ہوں:

نہیں ہے آسرا کوئی ہمارا حشر میں آقا
کریں گے آپؐ ہی رب سے سفارش یارسولؐ اللہ

ضیائے نور میں گزریں ہمارے رات دن سلطاںؐ
مسلسل ہم پہ ہو رحمت کی بارش یارسولؐ اللہ

.....

کام آئے گی روز محشر
اُنؐ کی نسبت لحہ لحہ

میری تربت پر برسے گا
ابرِ رحمت لحہ لحہ

.....

غنی ہو گیا پھر وہ دونوں جہاں میں
جو اک بار اُنؐ کی نگاہوں سے گزرا

اُن کی دہلیز حوالہ ہے جہاں میں
میری پہچان اُسی در سے کرائی جائے

جو بھی در حضورؐ کا دربان ہو گیا
اُس کے لیے نجات کا سامان ہو گیا

بنجر زمینِ قلب پہ رحمت کی بارشیں
ایسی ہوئیں عطا کہ میں حیران ہو گیا

کم تو نہیں یہ مجھ پہ نوازش حضورؐ کی
دیکھو میں اِک فقیر سے سلطانؐ ہو گیا

.....

نعت کے اپنے تقاضے اور ضابطے ہوتے ہیں جو اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پروانہ نہیں مل جاتا۔ رب کائنات کی عطا کردہ توفیقات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آدابِ نعت اور نعت گوئی کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے ورنہ نعت کو حمد بننے میں ذرا دیر نہیں لگتی ایک حقیقی نعت نگار کے لیے ورفعنا لک ذکرک کی باریکیاں اور اس کی ظاہری اور باطنی منازل تک رسائی اور آشنائی کا رمحال نہیں کہنے والے اِسی لیے نعت کو دو دھاری تلوار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ قصہ مختصر نعت کہنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور خود کو اس مشکل میں ڈالنے کے بجائے راہ فرار اختیار کر لی جائے تو کوئی عار نہیں۔ آخری جملہ سلطان محمود چشتی صاحب جیسے نعت گویان کے لیے نہیں ہے جنھیں نعت کہنے کا قرینہ اور سلیقہ آتا ہے اور وہ سرخرو اور کامیاب و کامران ہیں۔

☆☆☆☆☆

''حمدیہ قصیدے کے اُفق پر درخشاں ستارہ''

عباس علی شاہ ثاقب کا جوانی میں حمدیہ قصائد کے میدان میں مشقِ سخن کرنا ہرگز معمولی کام نہیں بل کہ یہ عطائے خاص ہے جو رب العزت اپنے چنیدہ بندوں پر کرتا ہے، اکثریت سے جب کوئی شاعر، شاعری کی طرف مائل ہوتا ہے تو غزل کے پڑاؤ کا مکین ہوتا ہے جب کہ عباس علی شاہ ثاقب نے اوّلاً ہی ایسے کام کو چھوا جو اک عمر کی مشقِ سخن کے بعد کی منزل ہوا کرتا ہے، انھوں نے غالباً اپنے ایم فل کے تھیسس سے تحریک پا کر اس حمدیہ قصیدے کے مجموعے کی سعی کی ہے۔ اپنے تحقیقی موضوع کی صنف کو تخلیقی سطح پر اپنانا یقیناً ان کی گہری دل چسپی اور تاب ناک مستقبل کی نوید ہے۔ حمدیہ قصیدہ میں انھوں نے اوروں کے لیے مشعل جلا کر رکھ دی ہے تا کہ آیندہ کے منظر نامہ میں حمدیہ قصیدے جیسی بابرکت صنف کو پذیرائی میسر ہو۔ فکری اعتبار سے حمدیہ قصائد قرآنی تعلیمات سے کشید کردہ اور مظاہرِ فطرت و کائنات کے عکس گر ہیں۔ پاک پتن کی دھرتی کے اس سپوت کی تخلیق کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ متنوع موضوعات کی حامل تشابیب، فنی چابک دستی سے گریز کا برتاؤ، مدح میں خیال کی ارفعیت اور دعا میں انفرادی و اجتماعی رنگ قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ شعری بالیدگی قدیم صنفِ ادب میں جدید فکری رجحان و مباحث، عصری آگہی کا شعور ان کی تخلیقی گرفت اور فکری نظام کی تشکیل کی صلاحیت ہم پر آشکار کرتی ہے۔

ایک ایسا وقت جسے ڈیجیٹیلائزیشن کا دور کہا جاتا ہے جب کہ لوگ تحریر کے بجائے تصویر اور تصویر کی جگہ ویڈیوز اور آواز کی جگہ متحرک تصویری رپورٹ کے خواہش مند ہوں ایسے

سید جمال زیدی

دور میں کتاب کو منظر عام پر لانا اور وہ بھی حمدیہ قصائد کا مجموعہ لانا انفرادیت اور سعادت مندی کی علامت ہے۔ اس مجموعہ کے خالق نے محض خیالی اور سوچ بچار کی بنیاد پر حمدیہ قصائد سپردِ قلم و قرطاس نہیں کی بل کہ ان کی فکر کو قرآن مجید فرقان حمید کی روشنی میں جلا ملی ہے۔ قرآن بینی کا ذوق اور حمدیہ قصیدہ نگاری کا رجحان ان کی ژرف نگاہی اور عالی بختی کو ثابت کرتا ہے۔ قرآن سے کشید کردہ موضوعات اور تحریکات کو منظوم پیرہن میں پیش کرنا کارگہ شیشہ گری کا عکس گر ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی مدح میں یوں حکم صادر فرماتا ہے:

"اور زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب قلمیں بن جاتے اور سمندر (ان کی سیاہی، پھر) اس کے بعد اس (پہلی سیاہی) کو سات سمندر مزید بڑھا دیتے تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوتیں بیشک اللہ عزت والا، حکمت والا ہے"۔

(ترجمہ: کنز العرفان)

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دور سے ہوتے ہوئے حمدیہ قصیدہ نگاری نے تحریک آزادی اور قیام پاکستان تک کے تہذیبی و ثقافتی و سماجی و تمدنی وارتقائی و فسادات کے ادوار کو دیکھا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی ادب کے زیر اثر بھی حمدیہ قصیدے نے اپنی روایتی خوبی سے رُوگردانی نہیں کی کیوں کہ ہر زمانی تغیرات کے باوجود ان کا ممدوح یکتا، یگانہ واحد و احد اور لاشریک ذات ہے جو زمانی و مکانی امکانات میں مقید نہیں بل کہ اس کی بادشاہت کی کرسی زمین و آسمان سے وسیع ہے۔ سائنسی علوم، علوم ظاہری و باطنی، منطق استدلال، مشاہدہ و مجاہدہ اور موجودات کو بڑی فکری ارفعیت سے قصائد کی زینت بنا کر ایک خوب صورت روایت کی طرح ڈھالنے کی سعی کی گئی ہے۔ قلم دراصل وہ شے ہے جس کی وساطت سے لفظوں کو تحریری روپ میں ڈھالا جاتا ہے۔ قلم اور تلوار کی اہمیت مسلمہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر دور میں ان دو چیزوں نے ہمیشہ اقوام اور معاشروں کے سُدھارنے یا بگاڑنے میں کلیدی نوعیت کا کردار نبھایا ہے۔ خواہ تلوار ہو یا قلم دونوں کا درست اور صاحب علم و ادراک کے ہاتھوں میں رہنا ملک و ملت کے کامیاب اور روشن حال و مستقبل کے لیے بے حد لازم ہے۔ یقیناً مقصدی نوعیت کے ادب کی طرف "نورِ توحید" کے خالق کا رجحان ان کے رجحان ساز فکری کینوس کا عکس گر ہے۔

ولا توصیف کی دھن چھیڑتی صدا نے حُسنِ ادا کے قرینے اور پیش کش کو سحر انگیز بنا دیا ہے۔ قصیدے کی ہیئتی تشکیل اور تکوینِ قصیدہ کی اکائیوں کو اہتمام سے نبھا کر تمام تمہیدیہ قصائد ہی کہے ہیں۔ تمہیدیہ قصائد کے مجموعے کی اشاعت پر انھیں اردو ادب کا اوّلین حمدیہ قصیدہ نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید جو کہ موصوف کے نگران مقالہ بھی تھے یوں

کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ شاہ صاحب نے قصیدے جیسی صنف کا انتخاب کر کے اس کو نبھانے کی کام یاب سعی کی ہے۔ ''اُردو میں نعتیہ قصیدہ نگاری'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی سند یافتہ ڈاکٹر نوید عاجز سے مشورہ سخن کی بدولت عباس علی شاہ ثاقب کی تخلیقی فعالیت ثمر آور ثابت ہوئی ہے۔

مختلف ادبا کی آرا کی روشنی میں ایک نظر ڈالتے ہیں:

ڈاکٹر ریاض مجید عباس علی شاہ ثاقب کی حمدیہ قصیدہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ثاقب کے ہاں روایت کی پاس داری دیکھنے میں آئی ہے۔ ثاقب نے تشبیب کی حصوں میں بڑی خوب صورتی پیدا کی ہے اس کے ایک قصیدے ''مدحِ درِ باری تعالیٰ جلّ شانہٗ'' کے یہ شعر دیکھیے:

چلو پوچھیں ستاروں کے جہاں سے
محبت ہے تجھے کس آستاں سے؟
یہ سیمیں ، گنگناتی آبشاریں
سریلے گیت لاتی ہیں کہاں سے؟
مگن جھلمل میں ہیں کیوں پکھیرو؟
انھیں رغبت بھلا کیوں ہے اذاں سے؟
کوئی میٹھے؛ کوئی کڑوے کسیلے
پھلوں میں ذائقے آئے کہاں سے؟''

....

ڈاکٹر رحمت علی شاد، ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''عباس علی شاہ ثاقب کی پہچان کے متعدد حوالے ہیں مثلاً وہ ایک محقق، نقاد، معلّم اور عمدہ شاعر بھی ہیں۔ عہد جدید میں قصیدے کی دم توڑتی ہوئی روایت کے احیا کے لیے کوشاں ہیں؛ جس کی بہترین مثال ان کا حمدیہ قصائد کا مجموعہ ''نورِ توحید'' ہے جو اردو ادب میں پہلا حمدیہ قصائد کا مجموعہ اور ایک درخشاں نمونہ ہے، جو یقیناً سادگی اور بے ساختگی جیسی صفات سے متصف ہے۔ یہ مجموعہ زبان و بیان کی چاشنی اور معنوی گہرائی کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے''۔

سید صبیح رحمانی مدیر نعت رنگ، کراچی یوں لکھتے ہیں:

ثاقب نے تشبیب میں بالعموم گردشِ روزگار اور زوالِ آدمیت کو موضوع بنایا ہے لیکن قصیدہ ''نور العالمین'' اور ''مصباحِ نور جلّ شانہٗ'' کی تشبیب سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ قصیدہ گوئی میں سنجیدہ محنت اور ریاضت ثاقب کی آیندہ تخلیقات کو مزید وقعت اور انفرادیت عطا کرے گی''۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان، صاحب زادہ ابوالحسن واحد رضوی، ڈاکٹر نوید عاجز، ڈاکٹر شبیر احمد قادری اور مظہر عارفی (کراچی) جیسے مشاہیر کا خراجِ تحسین پیش کرنا ان کی تخلیقات کے اعتراف میں گراں قدر ادبی حوالہ اور اثاثہ ہیں۔

ایک نوجوان کا اُردو ادب کا پہلا حمدیہ قصائد کا مجموعہ منظرِ عام پر لانا یقیناً ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے اور مستقبل میں ہمیں ان سے اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔

☆☆☆☆☆

نایاب ہیں ہم.....

دروازے کی گھنٹی بجتی ہے تو سامنے امی اور چھوٹا بھائی موجود ہوتے ہیں۔ دروازہ کھلتے ہی بھائی کہتا ہے: ''ٹیچر اسماء فوت ہوگئی ہیں۔'' یہ خبر سن کر تو جیسے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا۔ امی کہتی ہیں کہ اسماء کے میاں نے فون کر کے بتایا ہے۔ ابھی بے چاری کی عمر ہی کتنی تھی۔ دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

مجھے دو باتیں یاد آتی ہیں۔ ایک تو حال ہی میں ان کے گھر جو دو تین بار گئی تو وہ ہمیشہ کہتی تھیں کہ بیٹھو نا تو میں ہمیشہ جلدی واپس آجاتی یہ کہہ کر کہ بعد میں آؤں گی اور دوسرا کاش! میں رات کو چلی جاتی ان سے مل لیتی۔ لیکن افسوس کہ وقت تو ہاتھ سے اس طرح نکل گیا جیسے مٹھی میں سے ریت پھسل جاتی ہے۔ اتنے میں ابو آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میّت کا منہ دیکھنا ہے تو آؤ سڑک پر ایمبولینس رکی ہوئی ہے۔ جب بائیک پر بیٹھی ہوں تو جیسے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ذہن نے یک بارگی جست بھری اور وہ منظر سامنے آگیا جب ٹیچر پہلی بار ہمارے گھر آئی تھیں۔

نومبر کا سرد لیکن خوشگوار دن تھا، سال ۲۰۲۱ء، باہر گلی سے گاڑی کی آواز آتی ہے اور ہل چل محسوس ہوتی ہے؛ جیسے ساتھ جو خالی مکان ہے وہاں کوئی گھر بنانے آیا ہو۔ چھوٹی بہن کہتی ہے کہ آج ہمارے پڑوس میں ہماری ٹیچر اسماء رہنے آرہی ہیں۔ میٹرک کے آخری دنوں میں انھوں نے ہماری کلاس کو پڑھایا تھا لیکن اس لحاظ سے ان سے کوئی خاص انسیت نہیں تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے اور پانی کی بالٹی مانگی جاتی ہے۔ پھر دن کے وقت میں اور امی دن کے کھانے کا انتظام کر کے ان کے پاس جاتے ہیں۔ علم ہوتا ہے کہ وہ اور ان کا شوہر بس دو بندے ہیں۔ تھوڑی بہت بات چیت ہوئی اور جان پہچان ہوگئی۔

پھر روزانہ شام کو ان کا ہمارے گھر اور ہمارا ان کے گھر آنا جانا ہوگیا۔ ان کا اخلاق اتنا اچھا تھا کہ دل خود بہ خود ان کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ اپنے میاں کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ سکول میں ساتھی اساتذہ کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہونے والی تھیں۔ جب میں نے پارلر کے کام کا آغاز کیا اور انہیں اشتہار دکھایا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔

جب امی گھر نہ ہوتیں تو وہ بطور خاص آکر پوچھتیں کہ کھانا بنایا یا بنا دوں۔ وہ بہت سادہ

زہرا جمال

دل تھیں اور انھوں نے سادگی کو ہی اپنا شعار بنائے رکھا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں جب وہ کھلکھلا کے ہنستیں تو جیسے توسِ قزح کے رنگ سے کِھل جاتے۔ میری امی سے بھی ان کی دوستی ہوگئی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ اگست ۲۰۲۲ء آ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ٹیچر اسماء دودھ والی سویاں لائی ہیں۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ کاش مجھے علم ہوتا تو میں انھیں جانے ہی نہ دیتی۔ اگلے تین دن نہ وہ ہمارے گھر آئیں اور نہ ہی ہم لوگ ان کے گھر گئے۔ پھر اگست کی چھبیس تاریخ کو میری دونوں بہنیں ان کے گھر گئیں اور واپس آئیں تو کہنے لگیں: ''آج پتا نہیں ٹیچر کیوں پریشان تھیں؟'' کاش! کہ وہ وقت واپس آ جائے اور میں بہن کی بات سن کر ان سے ملنے چلی جاؤں۔'' وہ ان کی بظاہر جمیل حیات لیکن بہ باطن اجڑی زندگی کی آخری رات تھی۔

یہ چھبیس اور ستائیس اگست کی درمیانی رات تھی۔ سب سو رہے تھے جب اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ امی نے فون اٹھایا تو ٹیچر کے میاں نے بتایا کہ اسماء کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آپ آ جائیں۔ جب امی اور ابو گئے تو ان کے میاں نے کہا کہ ''تھوڑی دیر ہوئی ہے اس کی طبیعت ایسی ہے۔ لیکن میں نے رات ہونے کی وجہ سے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ سوتے سوتے اٹھی ہے اور ڈری ہے تو گر گئی ہے۔ اب ہوش نہیں آ رہا۔''

میرے نانا ابو نے ایک بار میرے ماموں کو کہا تھا: ''یار جمیل! جب موت آتی ہے تو سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔'' اور اس بات کے چار دن بعد نانا ابو جب اچانک اللہ کو پیارے ہوئے تو ماموں ننگے پاؤں ڈاکٹروں کے پاس دوڑے تھے۔ ایک ڈاکٹر کے پاس جو کہ ان کا شاگرد بھی تھا مریضوں کا ہجوم تھا وہ نہ آ سکا۔ دوسرا ڈاکٹر کرکٹ میچ کھیلنے جا رہا تھا اور اس کے نزدیک انسانی جان سے زیادہ اہم اس کا میچ تھا۔ تیسرا ڈاکٹر اپنے سسرال گیا ہوا تھا کیونکہ عید کا دوسرا دن تھا۔ تو ایسا ہی کچھ ٹیچر اسماء کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

جب انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو اس وقت رگوں کے جنگل سے زندگی کے قافلے کو گزرے بہت دیر ہو چکی تھی۔ سرد ہوا کا جھونکا چہرے پر پڑتا ہے تو ماضی سے حال کی طرف مراجعت ہوتی ہے۔ ٹیچر کے چہرے سے سفید کپڑا ہٹایا جاتا ہے تو وہی ہنستا مسکراتا چہرہ سامنے ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اب اس پر موت کی زردی چھا گئی ہے۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کتنی اچھی تھیں وہ اور کتنی جلدی چلی گئیں۔ اب بھی جب ساتھ والے مکان کا دروازہ کھلتا ہے تو لگتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہمارے گھر کا دروازہ کھلے گا اور دروازے پر ٹیچر اسماء ہوں گی۔

☆☆☆☆☆

سکول کینٹین [انشائیہ]

اگر سکول کی عمارت جسم ہے اور لائبریری اس کا دماغ تو یقین مانیے کہ کینٹین اس کا پیٹ ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ پیٹ کا رشتہ دماغ سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ سکول کے نقشے میں کینٹین وہ واحد مقام ہے جہاں نہ جانے والا طالب علم ہی ''مشکوک'' سمجھا جاتا ہے۔

کینٹین محض کھانے پینے کی جگہ نہیں تھی یہ ایک ''جنگ کا میدان'' تھا جہاں ہر روز ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ایک خوفناک یلغار ہوتی تھی۔ جیسے ہی گھنٹی بجتی جماعت میں زلزلہ سا آ جاتا تھا۔ وہ شریف اور تمیز دار بچے جو لیکچر کے آغاز میں ''نظم و ضبط کامیاب اقوام کا شعار ہے'' کا مضمون لکھ رہے ہوتے تھے اچانک وائی کنگز کا روپ دھار لیتے اور دروازے کی طرف ایسے لپکتے جیسے بند ٹوٹنے پر سیلاب کا ریلا بپھر جاتا ہے۔

سکول کی کینٹین کا جغرافیہ ہمیشہ ایک جیسا ہوتا ہے یعنی ایک چھوٹا سا کمرہ سامنے لوہے کی جالی والی کھڑکی (جو اسے جیل کم اور چڑیا گھر زیادہ بناتی ہے) اور اندر ایک پسینے میں شرابور انکل یا پھر آنٹی جی۔ یہ انکل دنیا کے سب سے مصروف انسان ہوتے ہیں۔ ان کے پاس صرف بیس منٹ ہوتے ہیں اور گاہکوں کی تعداد سینکڑوں میں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ وہ اس شور و غل اور ''انکل مجھے پہلے دے دیں، انکل بقایا دے دیں'' کی چیخ و پکار میں بھی یہ یاد رکھتے ہیں کہ کس نے پانچ روپے دیے تھے اور کس نے دس کا نوٹ لہرایا تھا۔

کینٹین کی سب سے بڑی سوغات ''نان نکی'' ہوتی تھی۔ یہ وہ نان نکی تھی جو نہ کبھی گرم دیکھی گئی نہ کبھی تازہ محسوس ہوئی مگر اس کے باوجود اس کی مقبولیت ایسی تھی جیسے سکول کی پوری معیشت اسی پر چل رہی ہو۔ ایک ٹھنڈا سا، ہلکا میلا نان... اور اس کے اندر دبی ہوئی وہ آلو کی نکی جو غالباً صبح فجر کے وقت تلی گئی ہوتی تھی۔ مگر جوں ہی کینٹین والا اسے ہاتھ میں دیتا، انسان خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین طالبِ علم سمجھنے لگتا تھا اور سب سے مزے

عمار نعیمی

کی بات یہ کہ اس کا ذائقہ فائیو سٹار ہوٹل کے بوفے پر بھی بھاری تھا۔

کینٹین کے باہر کا منظر کسی اسٹاک ایکسچینج سے کم نہیں ہوتا۔ وہاں ''کرنسی'' کا تبادلہ ہوتا ہے۔ سکول کے زمانے میں امارت کا معیار یہ نہیں تھا کہ آپ کے ابو کیا کرتے ہیں بل کہ یہ تھا کہ آج آپ کی جیب میں کتنے پیسے ہیں؟ جس کی جیب میں سو روپے کا نوٹ ہوتا وہ اس بیس منٹ کے لیے کینٹین کا ''مغلِ اعظم'' ہوتا تھا۔ اس کے ارد گرد خوشامدی دوستوں کا ایک حلقہ بن جاتا جو امید بھری نظروں سے اسے تکتا کہ ''شاید آج بھائی کا دل پسیج جائے اور ایک نان ٹکی ہماری بھی ہو جائے۔''

اور وہ ''ادھار'' مانگنے والے دوست! ہر گروپ میں ایک ایسا ماہر اقتصادیات ضرور ہوتا تھا جو کینٹین پہنچ کر جیبیں ٹٹولنے کی ایک شاندار اداکاری کرتا اور پھر کہتا: ''یار! آج پیسے گھر بھول آیا ہوں تم کھلا دو، کل پکا واپس کر دوں گا۔'' وہ ''کل'' قیامت تک نہیں آتی تھی۔ دراصل وہ ادھار نہیں ہوتا تھا وہ دوستی کا ٹیکس تھا جو ہم سب خوشی خوشی ادا کرتے تھے۔

کلاس روم میں ایک طبقہ وہ بھی تھا جو ''لنچ باکس'' لاتا تھا۔ یہ بیچارے بڑے مظلوم ہوتے تھے۔ ان کی ماؤں نے بڑے پیار سے پراٹھا اور رات کا بچا ہوا سالن پیک کر کے دیا ہوتا تھا لیکن کینٹین کی ''نان ٹکی'' اور ''سموسوں'' کی خوشبو کے سامنے گھر کا پراٹھا ایسے لگتا جیسے عیش و عشرت کے بیچ میں کوئی ''پرہیزگار'' آ بیٹھا ہو۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ لنچ باکس لانے والا خود کینٹین کے سموسے کھا رہا ہوتا اور اس کے دوست اس کا لنچ باکس صاف کر رہے ہوتے۔ گھر کا کھانا دوستوں کے لیے ''نعمت'' ہوتا تھا اور اپنے لیے ''سزا''۔

کینٹین پر وقت گزرنے کی رفتار بھی عجیب تھی۔ وہ بیس منٹ پلک جھپکتے گزر جاتے تھے۔ ابھی ہاتھ میں نان ٹکی آئی ہی ہوتی ابھی سموسے کا آخری کونہ منہ میں جانے کے لیے تیار ہوتا کہ وہ ظالم گھنٹی بج جاتی۔ بریک ختم ہونے کی گھنٹی! یہ دنیا کی اداس ترین آوازوں میں سے ایک ہے۔ اس گھنٹی کا مطلب تھا کہ جنت کا دروازہ بند ہو رہا ہے اور اب دوبارہ ''علم کی سولی'' پر چڑھنا ہے۔ آدھی کھائی ہوئی چیزیں جلدی جلدی نگلنا یا جوس کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کلاس کی طرف بھاگنا یہ ایک ایسی ریس تھی جس

میں ہر طالب علم نے حصہ لیا ہے۔
کینٹین صرف کھانے کی جگہ نہیں تھی یہ سماجی رابطوں کا مرکز تھی۔ کلاس میں استاد کے خوف سے جو زبانیں بند رہتی تھیں وہ یہاں قینچی کی طرح چلتی تھیں۔ یہاں اساتذہ پر تنقید بھی ہوتی، کرکٹ میچ پر تبصرے بھی اور سب سے بڑھ کر ''اساتذہ کی نقلیں'' اتاری جاتیں۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے بڑے بڑے منصوبے بنائے لڑائیاں کیں اور پھر انھی لڑائیوں کو ایک ''نان نکی'' کھلا کر ختم بھی کیا۔ یہاں کی دوستی کچی عمر کی تھی مگر پکی تھی۔

آج ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ ہماری جیبوں میں اب دس بیس کے مڑے تڑے نوٹ نہیں بل کہ ATM کارڈز ہیں۔ ہم اب مہنگے ترین کیفے میں بیٹھ کر مہنگی کافی پیتے ہیں جہاں ویٹر بڑے ادب سے مینیو بھی پیش کرتا ہے اور کوئی دھکم پیل نہیں ہوتی۔ وہاں سکون ہے صفائی ہے حفظانِ صحت کے اصول ہیں مگر سچ تو ہے کہ اس مہنگی کافی میں وہ ذائقہ نہیں جو اس کاغذ پر رکھ کر ملے ہوئے تیل والے سموسے میں تھا۔ اس ''منرل واٹر'' میں وہ ٹھنڈک نہیں جو کینٹین کے پاس پڑے واٹر کولر کے نلکے سے منہ لگا کر پانی پینے میں تھی۔ جہاں پیچھے سے دوست دھکا دے دیتے تھے اور سارا پانی شرٹ پر گر جاتا تھا۔
ہمیں لگتا تھا کہ ہم کینٹین پر ''بھوک'' مٹانے جاتے ہیں۔ کتنے نادان تھے ہم۔ ہم وہاں بھوک مٹانے نہیں بل کہ ''زندگی جینے'' جاتے تھے۔ وہ بیس منٹ کا وقفہ ہمیں یہ احساس دلاتا تھا کہ زندگی کتابوں کے بستے اور ہوم ورک کی ڈائری سے باہر بھی موجود ہے۔

آج دل کرتا ہے کہ کاش کوئی ایسی ٹائم مشین ہو جو ہمیں واپس اس لوہے کی جالی والی کھڑکی کے سامنے کھڑا کر دے۔ ہم دوبارہ وہی مڑا تڑا دس کا نوٹ انکل کی طرف بڑھائیں اور چیخ کر کہیں: ''انکل! ایک نان نکی اور ایک جوس... جلدی دینا یار گھنٹی بجنے والی ہے۔''
مگر اب گھنٹی نہیں بجتی۔
اب صرف خاموشی ہے اور یادوں کی ایک باسی خوشبو ہے جو کبھی نہیں جاتی۔
کینٹین بند ہو گئی ہے، انکل چلے گئے ہیں اور ہم... ہم ''سمجھدار'' ہو گئے ہیں۔
اور شاید سمجھدار ہونا ہی انسان کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔

☆☆☆☆☆

حمدیہ

ربِّ گل! ربِّ رنگ! ربِّ بہار!
ایک نقش اور، ربِّ نقش و نگار!

وسعتِ کائناتِ عشق دکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

کس لیے ارد گرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ در و دیوار

جرسِ گل سنائی دی نہ ہمیں
کر گیا کوچ کاروانِ بہار

راکھ کب تک کریدتے دل کی
ڈال کر سر پہ ہو گئے تیار

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن، دل خراش، دل آزار

اِک نم آہنگ حزنیہ لے پر
کیسے تھم تھم کے چل رہے تھے یار

دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

کون گنتا جوان لاشوں کو
کون رکھتا دلاوروں کا شمار

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

اک مذلت نشیں تھے ہم ہی یہاں
کوئی خاقان تھا، کوئی قاچار

تختِ مرمر پہ کل تھے آسودہ
مرمر آسودگان زیرِ مزار

آنکھ سر پھوڑتی رہی خالد!
اور منہ دیکھتی رہی دیوار

خالد احمد

الوداع اے ارضِ بولان

دیارِ کوئٹہ!
یہ کیا ستم ہے!
بہت بھاری ہے
گٹھڑی چاہتوں کی

کہوں کیا
کس قدر مشکل ہوا ہے
یہ وادی چھوڑنا
زندہ دلوں کی

ہیں دل جھولی میں
صد شاداب یادیں
محبت خوشبوؤں مہکے
دنوں کی

بیاں کیونکر کروں
لفظوں میں ان کو
رہا ہوں بھیڑ میں
جن حیرتوں کی

میں میدانوں میں
واپس جا رہا ہوں
کہانی ساتھ لے کر
پربتوں کی

سلامت بام و در،
گلیاں، بغیچے
رہے آباد
بستی دلبروں کی

رہیں روشن سدا
بازار تیرے
نہ کم ہوں رونقیں
نعمت کدوں کی

الاؤ درد کا جلتا رہے گا
کتھارکتی نہیں
شُبھ سلسلوں کی

جلیل عالی

مختصر نظمیں

حیرت

قبر میں ہو گیا بدن میلا
حیرت اس بات پر ہوئی ہے مجھے
کیوں ذرا بھی نہیں کفن میلا !

....

یہ شہر

یہ شہر تو ملبہ ہو بھی چکا
جو زلزلہ آنے والا ہے
اس کا تو غلبہ ہو بھی چکا !

....

دیوارِ مہربانی

دوسروں پر مہربانی کرنا
کسی انسان کے لیے تو اور بھی مشکل
ہے
کیونکہ دیوارِ مہربانی کو بھی
ضرورتمندوں کے لیے اشیائے
ضرورت
خود پر لٹکوانے کے لیے
اپنے سینے میں کیلیں ٹھکوانی پڑتی ہیں!

....

کمی

پنجرہ خالی ہو جانے کا ماتم کرنے والے
جانے کیونکر
اُڑ جانے والے پرندے کو یاد نہیں کرتے
ممکن ہے وہ سوچ رہے ہوں
پنجرے میں بازار سے کوئی اور پرندہ
آ جائے گا!

نسیمِ سحر

تم اگر چاہو تو.....

ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا،
مجھے کب آنا ہے؟
تم کہاں تک مجھے ڈھونڈو گی،
مجھے یاد کرو گی، جاناں!
روز فریاد کرو گی، جاناں!
عمر برباد کرو گی، جاناں!

میں بہت دُور،
بہت دُور نکل آیا ہوں
اجنبی دیس میں،
پردیس میں،
روز و شب نے، مجھ کو زندانی بنا کر رکھا ہے
پا شکستہ،
جسے سیلانی بنا رکھا ہے
راستے مٹتے چلے جا رہے ہیں
دائرے کھنچتے چلے جا رہے ہیں

میں نکلنا بھی اگر چاہوں، تو
باہر آنا بھی اگر چاہوں تو،
روک لیتا ہے کوئی خطِ محیط،
حدِ بسیط

تم اگر چاہو تو،
اِس مسئلے کا
دوسرا حل بھی نکل سکتا ہے
موسمِ گریہ بدل سکتا ہے

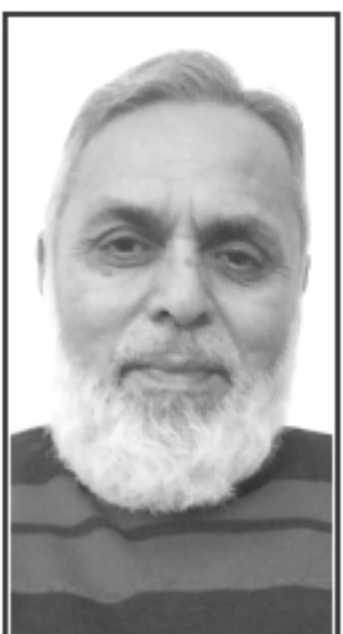

محمد انیس انصاری

امر کہانی

سید افسر ساجد

میں نے جس حال میں اُسے دیکھا
اس کی آنکھوں میں نیم خوابی تھی
اس کا چہرہ سکوں سے عاری تھا

داستاں میں نے جب سنی اس کی
مجھ کو محسوس یوں ہوا جیسے
یہ کہانی امر کہانی ہے ... ...
جس میں کردار سارے مُشترکہ
درد اور بار سارے مُشترکہ

گفتگو ان کی بے زبانی ہے
زود رنج اُن کی زندگانی ہے
لوح محفوظ کے تصور میں
اپنے حالات پر وہ قانع ہیں

میرا مہماں تھا یا مرا ہمزاد
سوچ میں مُبتلا ہوں میں اب تک
اب وہی میں ہوں اور اس کا خیال

خواب

یہ خواب راتوں میں چاند کے ہمسفر رہے ہیں
یہ خواب رنگین تتلیوں کی سپر رہے ہیں
یہ خواب میں نے اُداس دن میں رقم کیے تھے
یہ شہر والے کہاں پڑھیں گے!
یہ قصے میں نے سیاہ راتوں کی ظلمتوں میں رقم کیے تھے
یہ خواب پچھلی کہانیوں کے الاؤ کی راکھ کا شرر ہیں
گراں نویسوں نے اس فسانے کو خیر آباد کہہ رکھا تھا
یہ قصے میں نے سیاہ راتوں کی سسکیوں اور
سسکیوں میں رقم کیے تھے
یہ تتلیوں کے پروں، گلابوں کی پتیوں، پھوٹتے لہو
پھٹتے آبلوں کی کہانیاں ہیں
یہ شہر والے کہاں پڑھیں گے
گراں نویسوں، گراں فروشوں کی خلوتوں میں
یہ قصے انجام تک پڑھے جائیں گے مگر
حشر تک سرہانے پڑے رہیں گے
گراں فروشوں، گراں نویسوں کے لب یہ قصے
نہ کہہ سکیں گے
وہ اس کی حدّت نہ سہہ سکیں گے

رخشندہ نوید

بے وُقعت سائے

پہلے میں بھی اک سایہ تھا
میرا کوئی جسم نہیں تھا
آج بھی بس اک سایہ ہوں
ہر دم سوچ میں رہتا ہوں
شام کے جب سائے پھیلیں گے
دھوپ سیاہی مائل ہوگی
میری ذات انہی سایوں میں گُم ہوگی
پھر کیا ہوگا؟
جیسے بارش کا اک قطرہ
دور تلک پھیلے پانی میں گُم ہو جائے

بڑھتے پھیلے سائے مل کر
تاریکی کا ایک سمندر بن جائیں تو دھوپ کی کرنیں
یوں لرزیں جیسے اک کشتی
لہروں پر ڈولے
دھیان کی سُونی پگڈنڈی پر
پھیلا میں اک سایہ ہوں
ہر دم سوچ میں رہتا ہوں

سایہ سایہ مل جائیں تو
تاریکی کا ایک سمندر
سارے جسم نگل جائے گا

فیاض تحسین

اُداس لڑکی

مرے خیالوں کی بالکونی میں تنہا بیٹھی
اُداس لڑکی
جو چاندنی کا لباس پہنے
ستارے دامن میں بھر رہی ہے
وہ ڈر رہی ہے
رہِ محبت میں ڈگمگا کر سراب ہستی میں گرنے والی
اُداس لڑکی
گزشتہ لمحوں کی بے وفائی کے تپتے صحرا کی ریت میں گُم
گہر محبت کے ڈھونڈنے میں مگن ہے لیکن
بدن کے گُلشن کی ٹہنی ٹہنی پہ تازہ غُنچے
مچل مچل کر بہار رُو کی نوید سب کو سنا رہے ہیں
نظر کو پاگل بنا رہے ہیں
چھچھورے گُلچیں بھی گھات میں ہیں
جو اِس کی خوشبو
مشامِ جاں میں اُنڈیلنے کی تمنا لے کر
رہِ ہوس میں بھٹک رہے ہیں
کوئی پریشاں اداس لڑکی کو یہ بتا دے
وفا کا پانی
جفا کے صحرا کی دُور گہری تہوں میں گُم ہے
بھلا کے صحرا نوردیوں کو
وہ لَوٹ آئے

اکرم سحر فارانی

ایک ہی شخص

ایک ہی شخص ہے
گھر میں اور اسٹیشن پر

اسی شکل کا ایک مسافر
چڑھتا پائیدان
کھڑکی والی سیٹ پہ بیٹھتا
خود کو
رُخصت کرنے
اُسی مہاندرے میں آیا ہے

اُڈی پڑتی ہے
خوشبُو
اس کے کپڑوں سے
کبھی نہ واپس آنے کی

ریل کی پٹڑی
بند ہے
رینگ رہی ہے گاڑی
ایک ہی وقت میں
کتنے لوگوں کی آنکھوں میں
آنسُو ہیں

تنویر قاضی

تنہا اُجاڑ گھر (نثری نظم)

دُور پہاڑ کے دامن میں
مکینوں کی راہ تکتا.....ایک تنہا گھر
گھر کے ہر گوشے میں ویرانی کے ڈیرے ہیں
در و دیوار کی بوسیدگی
کچھ مانوس آوازوں میں نوحہ کناں ہے
ہوائیں سرگوشیاں کرتی کرتی تھک جاتی ہیں
وقت بھی کبھی ستانے کو تھم جاتا ہے
درختوں کے گھٹتے بڑھتے سائے اُکتائے
ہوئے رہتے ہیں
تنہائی جب دریچوں سے جھانکتی ہے تو لگتا ہے
کہ گھر کی خاموشی جو پہلے شوریدہ حال تھی
اب آسودہ ہے
گھر کے اُجڑے صحن میں ماضی کی بیش قیمت یادیں
فضاؤں میں معلق نغمہ سرا رہتی ہیں
پچھم سے آتے ہواؤں کے آوارہ جھونکے
ایک اَن سُنی دلفریب مگر اُداس دُھن چھیڑ دیتے ہیں
کہیں دُور جا کے بسنے والے گھر کے مکین
اب برسوں سے لوٹ کر نہیں آئے
اب تو شاید اُنھیں گماں بھی نہیں ہوگا
کہ تنہا اُجاڑ گھروں میں سناٹوں کی بازگشت
تنہائی کے درد کی گرد میں اَٹے در و دیوار
زندگی کی دِل سوز کہانی کی منظر کشی کی
حد تک رہ جائیں گے

طلعت شبیر

اور گناہوں کا لباس (نثری نظم)

خواب میں کیا ہوا گناہ
ہوش میں کیا ہوا ثواب
ایسے گناہ میں اپنا دخل نہیں ہوتا
ہر ثواب کے پیچھے
غرض اور لالچ ضرور ہوتا ہے
جنت ماپنے
اور خدا کو جانچنے کا راستہ
عبادت اور ثواب کے راستے سے ہو کر گزرتا ہے
بدی اور اور گناہ کا تصور
شیطان کے گھر سے
انسان کے
دل و دماغ تک سفر کرتا ہے
رات کے آٹھویں پہر میں قید لمحے
دونوں قوتوں کے گواہ ہوتے ہیں
خواب ہوں یا حقیقت
وہم حقیقت کی گود میں پلتا ہے
خواب شعور سے ہو کر
لاشعور کے گھر میں جنم لیتا ہے
الجھی ہوئی نیندیں
اندھے خیالوں کو جنم دیتی ہیں
اندھا، گونگا، بہرہ وجود
گناہ اور ثواب کی تمیز سے
مبرا ہوتا ہے
دیکھنے میں لگنے والا ثواب
کسی نہ کسی گناہ کا لباس ہوتا ہے

سمیع اللہ عرفی

ماں

دودھ اور شہد میں گوندھا پہلے
عرشِ بریں کی مٹی کو
اس میں اپنا عکس ملایا
نور کی بارش میں نہلایا
ممتا کا پیکر پہنایا
پھر ایسا شاہکار بنایا
جو دھرتی پر ماں کہلایا
قدرت کی فنکاری ماں ہے
پھولوں کی پھلواری ماں ہے
اس سا کوئی اور کہاں ہے؟
ماں کا رشتہ سب سے افضل
خالق نے تخلیق کیا ہے
پیار محبت مہر و فا اخلاص سے مالا مال کیا ہے
اپنے بعد خدا نے اونچا ممتا کا اقبال کیا ہے
چار کتابوں سے بھی پہلے
جیسے جسم میں جاں اتری ہے
اس دھرتی پر ماں اتری ہے
جس کی کوکھ سے جنم لیا ہے
ہر اک پیر پیمبر نے
سادھو سنت فقیر اور جوگی
بے راگی بنجارے روگی
صوفی قطب ابدال ولی سب
ممتا کے مرہونِ منت

ماں جس کے قدموں میں جنت
ماں جس کی آنکھوں میں ٹھنڈک
سرتا پیر محبت ہے یہ
شفقت ہے یہ چاہت ہے یہ
رحمت برکت راحت ہے یہ
عزت ہے یہ حرمت ہے یہ
عجز نیاز کی صورت ہے یہ
قدرت کا بہروپ ہے ممتا
رب کا دوسرا روپ ہے ممتا
دھوپ کڑی میں چھاؤں جیسی
وسعت میں دریاؤں جیسی
کون سی ہستی ماؤں جیسی؟
جسم سے جیسے جاں کا رشتہ
آیت سے قراں کا رشتہ
وہ بچے سے ماں کا رشتہ
ماں چاہے انسانوں کی ہو
جنگل کے حیوانوں کی ہو
چاہے کسی پرندے کی ہو
یا پھر کسی درندے کی ہو
ماں تو ماں ہے
ممتا میں اتنی طاقت ہے
وہ ننھی سی چڑیا کو بھی
پل میں باز بنا سکتی ہے
وہ اپنے بچوں کی خاطر
موت سے جان لڑا سکتی ہے

کوؤں کی یلغار کے آگے
سینہ تان کے آسکتی ہے
ہر مشکل میں فاختہ اپنے بچوں کے آگے ہوتی ہے
ماں وہ ہستی
جس کی گود ہے اطلس اور کم خواب سے بڑھ کر
انجم اور مہتاب سے بڑھ کر
پیار کا موجیں مارتا دریا
ہر اک ماں کا سینہ ہے یہ
ممتا کا دل کھول کے دیکھوں
جیسے شہر مدینہ ہے یہ
اس دھرتی کا کونہ کونہ
اس مٹی کا ذرہ ذرہ
ممتا کے اوصاف کا شاہد
ماں چاہے مشرق کی ماں ہو
ماں چاہے مغرب کی ماں ہو
قربانی ایثار کی مورت
شفقت کی احساس کی صورت
چھاتی سے لپٹا کر بچے
خود گیلے پر سونے والی
صورت اور کردار کی دیوی
ممتا عین فرشتوں جیسی
کب ہے دوسرے رشتوں جیسی
دنیا میں اکلوتی نعمت
صرف اور صرف بہشتوں جیسی
ماں کی گود میں سر رکھتے ہی
کیسے ہمیں اماں ملتی ہے
ایسے کوئی کب ملتا ہے؟
جیسے اپنی ماں ملتی ہے
بچوں کے چہرے پڑھتی ہے
ان کے ہر اک دکھ اور سکھ کا
سو فیصد اندازہ ماں ہے
دور شفق کے چہرے پر وہ
صبحِ نو کا غازہ ماں ہے
جنت کا دروازہ ماں ہے
چہرے کی تقدیس کو دیکھوں
پھولوں سے بھی تازہ ماں ہے
ممتا کے قدموں سے اونچا
کوئی اور مقام نہیں ہے
ماں سے بڑھ کر اس دنیا میں
کوئی دوسرا نام نہیں ہے
ممتا کو تخلیق کیا
قدرت نے اپنے ہاتھوں سے
اس میں اپنا عکس ملایا
نور کی بارش میں نہلایا
چار کتابوں سے بھی پہلے
جیسے جسم میں جاں اتری ہے
اس دھرتی پر ماں اتری ہے

مسعود احمد

صورت گر (نثری نظم)

ایک خواب کی
بے شمار تہیں ہو سکتی ہیں
لاتعداد زاویے
جنھیں فراموش کیا جا سکتا ہے

ایک چہرہ
کتنے چہروں میں
اپنی شناخت چُھپا سکتا ہے

جیسے ایک بات
مختلف رنگوں
لفظوں
اشاروں
اور کنایوں میں رہتے ہوئے
دوسرے معنی کا لباس پہن لیتی ہے

جیسے تم
اپنے ذہن کو
محبت کی آماجگاہ بنا سکتے ہو
اور نہیں بھی
دل کو
دنیا کے شور کا
آئینہ خانہ بنا سکتے ہو
اور نہیں بھی

میں
آگ میں پانی نہیں
بلکہ
پانی میں آگ لگاتا ہوں
تاریکی
میرا خام مال ہے
اور الفاظ
روشنی کی تخلیق

امجد بابر

''جدائی ہم کو راس ہے''

ایک ہی گھر میں
ایک ہی چھت تلے کئی برس تک
ہم دونوں تنہائی بنتے رہے
گفتگو میں گرچہ تعطل تو نہ تھا مگر
اک اجنبیت سی سدا درمیاں حائل رہی
اس سے پہلے کہ تلخیٔ حیات
سب سنہرے دن نگل لیتی
ہم جدا ہو گئے
تعلق کے بوجھ سے اب من میرا آزاد ہے
اور سنا ہے تم بھی اب کھل کر ہنستے ہو
روح تمہاری بھی شانت ہے
سچ کہا ہے کسی نے.....کہا
''جدائی ہم کو راس ہے''

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے کہہ جاتے ہو، تم بھی ساری باتیں
میرے وار پہ اپنے آگے میری ڈھال نہ کرنا

''تجھ تک آتے ہوئے''

سید تیمور کاظمی

عجیب دن تھا
یہ آنکھ سورج کے جاگنے سے ذرا سا پہلے ہی کُھل گئی تھی
تمہارے خوابوں کی ریت
مُٹھی سے رفتہ رفتہ پھسل رہی تھی
فضا بھی رنگت بدل رہی تھی
میں اپنے چہرے پہ چہرہ اوڑھے
بدن سے باہر نکل پڑا تھا کہ بے خیالی میں
چاند تاروں پہ پاؤں رکھتا
نئے زمانوں کو چل پڑا تھا
خیال رکھتے، گریز کرتے
تمہاری جانب کو چلتے چلتے
میں اپنی حد سے گزر رہا ہوں
تمہارے ہونے کی اِس کمی کو
میں اپنی کثرت سے بھر رہا ہوں
مگر یہ منظر بھی کون دیکھے
جہاں محبت بھی
خاص سے عام ہوگئی ہے
یہیں کہیں
مجھ کو راہ میں شام ہوگئی ہے

ایک تاریخ (انثری نظم)

محمد عبداللہ

سلامتی والی حیاتی کو
سمجھنے والے
حسد کی بندشوں کو توڑ کر
طاق و جفت کی گنتی
سے آزاد
سورج چمکنے سے پہلے اور
سورج چمکنے کے بعد
اور پھر
سورج ڈوبنے سے پہلے
اپنے رب کی پاکی بیان کرتے ہیں

حرفِ تازہ کی روانی میں
کہیں بیانیہ اور کہیں پوشیدہ
رفاہِ عامہ کے معاملات سلجھاتے ہیں

رات کی تاریکیوں میں
روشن تارے کی صورت جگمگاتے ہیں
وہی ذی روح کامیاب ہیں
وہی مبارک باد کے مستحق ہیں

وصیت

عاصم بخاری

بہہ چکا ہے بہت لہو میرا
میرا بچنا محال ہے اب کے
آنکھیں بھی ہو رہی ہیں سرخ گلاب
اب کے بچنا محال ہے میرا
میرے بیٹو ! ہو گر مرے بیٹے
سُن لو یہ بات دونوں کانوں سے
دیر کر دیں اگر مرے بھائی
قبر کی مٹی ہو ابھی تازہ
کھانا پینا حرام ہی سمجھو
سونا تب تک حرام ہی جانو
میرے اس قتل کا ہو بدلہ جلد
لاج رکھنی ہے اپنی خیلی کی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھوڑتے ہی نہیں زندانِ تعلق خالد
کچھ اسیروں کو اگر چھوڑ دیا جاتا ہے

پلک پر تارا
(خالد احمد سے مکالمہ)
نعمان منظور

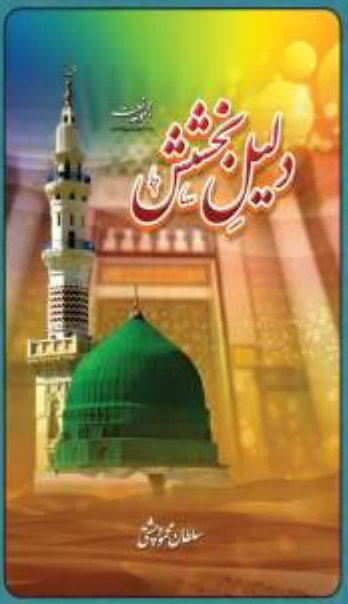

دلیلِ بخشش
سلطان محمود چشتی

خواب کی اذیت میں
سلیم فگار

نقطہ
اپنے آپ کو جاننے کا
وقاص امجد رانا

ہتھیلیوں پہ چراغ
تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
خالد احمد